صبحِ کشمیر



مولانا وحید الدین خاں

صبحِ کشمیر

مولانا وحید الدین خاں

Subah-e-Kashmir

by Maulana Wahiduddin Khan

First Published 2011

CPS International
(Centre for Peace and Spirituality International)
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
e-mail: info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
e-mail: info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301
Delhi NCR, India
e-mail: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Printed in India

فہرست

آغازِ کلام

ماہ نامہ الرسالہ، اکتوبر 1976 میں جاری ہوا۔ بالکل شروع ہی سے وہ ریاست جموں وکشمیر میں پھیلنے لگا، یہاں تک کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ماہ نامہ الرسالہ کے ذریعے، الرسالہ مشن اب جموں وکشمیر کے تقریباً ہر گھر میں پہنچ چکا ہے۔

اِس سلسلے میں ایک کڑی کے طور پر حال میں تین بار دعوت کے موضوع پر دہلی میں کشمیر میٹ (Kashmir Meet) ہوئی۔ اِس میٹ (اجتماع) کی تاریخی تفصیل یہ ہے:

کشمیر میٹ اول: 5-6 فروری 2011

کشمیر میٹ دوم: 29-30 اکتوبر 2011

کشمیر میٹ سوم: 25-26 نومبر 2011

اِن اجتماعات کا جو موضوع تھا، وہ صرف ایک تھا یٰ کشمیر میں دعوتِ اسلامی کا احیاء۔ اِس موضوع پر جو تقریریں ہوئیں، یا اہلِ کشمیر سے جو گفتگو ہوئی، اس میں کشمیر سے تعلق رکھنے والے تمام موضوعات زیر بحث آئے۔ الرسالہ کے زیر نظر شمارے میں، ان تقریروں اور گفتگو کا خلاصہ شائع کیا جا رہا ہے۔

یہ خلاصہ روداد کی شکل میں نہیں ہے، بلکہ وہ شذرات (fragments) کی شکل میں ہے۔ مختلف باتیں اور تاثرات الگ الگ عنوان کے تحت درج کئے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ کشمیر میں امن کے قیام اور دعوتِ اسلامی کے فروغ کے لیے ان شاء اللہ ایک بوسٹر (booster) ثابت ہوگا۔

نئی دہلی، یکم دسمبر 2011 وحید الدین خاں

صبحِ کشمیر

1917 میں روس میں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت قائم ہوئی۔ اس کے بعد اِس کمیونسٹ حکومت نے مسلسل یہ کوشش شروع کی کہ وہ اطراف کے علاقوں میں کمیون ازم کو برآمد (export) کرے۔ اِنھیں میں سے ایک نشانہ تاشقند کا ملک تھا جس کا دار السلطنت سمرقند تھا۔ اُس زمانے میں ایک کمیونسٹ رائٹر نے اِس موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی، جو ''صبح سمرقند'' کے نام سے شائع ہوئی:

Joshua Kunitz, Dawn Over Samarkand, 1935, 350 pages, The Van Rees Press, New York

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کشمیر میں اب ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ اِس دور کو درست طور پر ''صبح کشمیر'' (Dawn Over Kashmir) کہا جاسکتا ہے۔ کشمیر میں یہ دور کسی خارجی سبب سے نہیں، بلکہ خود اہلِ کشمیر کے اندر ابھرنے والی نئی سوچ کے زیر اثر وجود میں آیا ہے۔ اکتوبر 1989 میں کشمیر میں مسلح جدوجہد شروع ہوئی۔ اُس کے بعد کشمیر میں جو تباہی پیش آئی، اس کے حوالے سے وہاں ایک کتاب شائع کی گئی تھی۔ اِس کتاب کا نام ''زخمی کشمیر'' (Wounded Kashmir) تھا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہاں ایک نئی کتاب چھاپی جائے، جس کا نام صحت مند کشمیر (Healthy Kashmir) ہو۔ الرسالہ کا زیر نظر شمارہ، گویا کہ کشمیر کے اِسی نئے صحت مند دور کا ترجمان ہے۔

فطرت کا قانون اور تاریخ کا تجربہ دونوں یہ بتاتے ہیں کہ خدا کی اِس دنیا میں تخریبی آغاز کی ایک حد (end) ہے، لیکن اِس دنیا میں تعمیری آغاز کی کوئی حد نہیں۔ 1947 میں تقسیم ہند کے بعد کچھ ناعاقبت اندیش لیڈروں نے خود ساختہ تصورِ جہاد کے تحت کشمیر میں تخریبی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ قانونِ فطرت کے تحت اب اِس تخریبی جدوجہد کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اب کشمیر میں، کشمیر کی تاریخ کا نیا سفر شروع ہو چکا ہے۔ قانونِ فطرت کے تحت لازماً یہ واقعہ پیش آنا ہے کہ یہ تعمیری سفر مسلسل جاری رہے، یہاں تک کہ وہ اپنی آخری منزل پر پہنچ جائے۔

تخریب کے بعد تعمیر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا دعوتی مشن شروع کیا۔ مکہ میں آپ

کے مشن کو سخت مزاحمت کا سامنا پیش آیا۔ حالات کے تقاضے کے تحت 622 عیسوی میں آپ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ مکہ کے برعکس، مدینہ میں آپ کو نہایت موافق حالات ملے۔ مدینہ میں کسی رکاوٹ کے بغیر اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ مدینہ میں ایسا کیوں ہوا، اِس کا جواب حضرت عائشہ کی ایک روایت میں ملتا ہے: کان یوم بُعاث یوماً قدّمہ اللّٰہُ لرسولہ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 3777) یعنی جنگ بُعاث، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے لیے ایک خدائی رحمت کی حیثیت رکھتی تھی:

The battle of Bu'ath was a blessing in disguise for the Prophet of Islam.

مدینہ (یثرب) میں دو بڑے قبیلے تھے — وس اور خزرج۔ قبائلی مزاج کے مطابق، اِن دونوں کے درمیان اکثر ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا۔ ہجرت کے پانچ سال پہلے دونوں قبیلوں کے درمیان ایک خوں ریز جنگ ہوئی۔ اِس جنگ کو ''جنگِ بُعاث'' کہا جاتا ہے۔

اِس جنگ میں دونوں قبیلوں کے افراد بڑی تعداد میں مارے گئے۔ اِس کے بعد اہلِ یثرب کے اندر سکنڈ تھاٹ (second thought) پیدا ہوا۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ سمجھنے لگے کہ اُنھیں باعزت زندگی حاصل کرنے کے لیے تشدد پر مبنی آئڈیالوجی کے بجائے، امن پر مبنی آئڈیالوجی درکار ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب کہ اسلام کی دعوت مدینہ پہنچی اور وہ تیزی سے لوگوں کے دلوں میں داخل ہوگئی۔

تقریباً یہی صورتِ حال ریاست جموں وکشمیر میں پیش آئی ہے۔ 1947 میں تقسیم ہند کے بعد اِس ریاست میں جلسوں اور مظاہروں کی صورت میں ''جہادِ کشمیر'' شروع ہوا۔ ایک عرصے کے بعد اِس تحریک نے تشدد کی صورت اختیار کرلی۔ ایک طرف، کشمیری مجاہدین تھے اور دوسری طرف، انڈین آرمی۔ یہ ایک نامساوی تصادم تھا۔ چناں چہ فطری طور پر ایسا ہوا کہ کشمیر کے لوگ بڑی تعداد میں مارے گئے۔ مسلح تصادم کے نتیجے میں جو حالات پیدا ہوئے، اُس نے کشمیر کو ہر پہلو سے شدید نقصان پہنچایا۔ تعلیم اور سیاحت اور اقتصادیات اور دوسرے سماجی ادارے ناقابلِ تلافی حد تک تباہ ہوگئے۔

اِس صورت حال کو دیکھ کر اہلِ کشمیر کا ضمیر جاگ اٹھا۔ اُن کے اندر بڑے پیمانے پر نظر ثانی (rethinking) کا عمل جاری ہوگیا۔ اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اب اہلِ کشمیر نے مسلح ٹکراؤ کو چھوڑ دیا، اور انھوں نے پُرامن دعوت کا طریقہ اختیار کرلیا۔

آج صورت حال یہ ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں قدیم طرز کی ملٹنسی (militancy) تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ اب اہلِ کشمیر، ون مین ٹومشن (one man, two mission) کا کلچر اختیار کررہے ہیں۔ ایک طرف، وہ تعلیم اور تجارت جیسے شعبوں میں اپنا مستقبل تلاش کررہے ہیں، اور دوسری طرف، وہ پرامن دعوت کو اپنا دینی فرض سمجھ کر دعوت الی اللہ کا کام کررہے ہیں۔

پیغمبرانہ ماڈل

حضرت یوسف ایک اسرائیلی پیغمبر تھے۔ اُن کا زمانہ ساڑھے تین ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ وہ کنعان (فلسطین) میں پیدا ہوئے، پھر مخصوص حالات کے تحت وہ مصر پہنچے۔ یہاں اُس وقت ایک بادشاہ کی حکومت تھی۔ حضرت یوسف کے اِس قصے کو قرآن میں احسن القصص (best story) کہا گیا ہے۔ اِسی طرح، حضرت محمد ایک اسماعیلی پیغمبر تھے۔ ان کا زمانہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے کا زمانہ ہے۔ آپ کے زمانے میں ایک مشہور واقعہ پیش آیا۔ اِس واقعے کو اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں اِس واقعہ کو فتح مبین (48: 1) کہا گیا ہے۔

یہ دونوں واقعات دو پیغمبروں کے نمونے ہیں۔ اِن دونوں واقعات سے مشترک طور پر معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی جدوجہد کا کامیاب فارمولا کیا ہے۔ وہ فارمولا یہ ہے— سیاسی معاملے میں یک طرفہ صلح، اور دعوت کے میدان میں پُرامن جدوجہد:

Political statusquoism, Dawah activism

حضرت یوسف کے زمانے میں مصر میں ایک بادشاہ کی حکومت تھی۔ بادشاہ نے حضرت یوسف کو یہ پیش کش کی کہ وہ بادشاہ کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہوئے ملک کے انتظام (administration) کا عہدہ قبول کرلیں۔ قرآن میں اِس کے لیے دینِ ملِک (12:76) کے الفاظ آئے ہیں، اور بائبل میں اس کی بابت یہ الفاظ ہیں: سوتو میرے گھر کا مختار ہوگا، اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے، میں بزرگ تر ہوں گا:

> You shall be over my house, and all my people shall be ruled according to your word; only in regard to the throne, will I be greater than you.(Genesis, 41: 40)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مکہ میں 610 عیسوی میں ہوئی۔ اُس زمانے میں قریش کو عرب میں قیادت کا مقام حاصل تھا۔ پیغمبر اسلام نے قریش سے امن کا معاہدہ کیا، جو اسلام کی تاریخ میں، معاہدۂ حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ اِس معاہدے کے تحت، پیغمبر اسلام نے قریش کی قائدانہ حیثیت کو تسلیم کرلیا، اور قریش کی یک طرفہ شرطوں کو مانتے ہوئے آپ نے اُن سے 10 سال کا ناجنگ معاہدہ (no-war pact) کرلیا۔ اِس معاہدے کے مطابق، قریش کی قائدانہ حیثیت برقرار رہی، اور آپ کو پر امن دعوت کے لیے کھلے مواقع مل گئے۔

یہی اجتماعی کام کا پیغمبرانہ ماڈل ہے۔ اہلِ کشمیر اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو اِسی پیغمبرانہ ماڈل کی پیروی کرنی ہے۔ یہی واحد ماڈل ہے جس کی پیروی کرکے مسلمان دنیا میں عزت اور کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ اِس کے سوا کوئی دوسرا ماڈل اِس دنیا میں قابلِ عمل نہیں۔

اِس کے مطابق، اہلِ کشمیر اور دنیا کے تمام مسلمانوں کے اوپر فرض ہے کہ وہ نفرت اور تشدد کا طریقہ مکمل طور پر چھوڑ دیں۔ وہ مسلح جدوجہد (armed struggle) کے لفظ کو اپنی ڈکشنری سے ہمیشہ کے لیے نکال دیں۔ وہ نفرت پر مبنی لٹریچر کو جلا دیں، وہ ٹکراؤ کی سیاست کو کامل طور پر چھوڑ دیں، وہ اپنے تمام ہتھیاروں کو ہمیشہ کے لیے دریا میں پھینک دیں، وہ دوسرے انسانوں کے حریف (rival) بننے کے بجائے، دوسرے انسانوں کے خیر خواہ (well-wisher) بن جائیں، وہ دل سے انسان دوست کلچر (human-friendly culture) کو اختیار کرلیں، ایسا کرنا اپنی خواہش پر چلنے کے بجائے، خدا کی صراطِ مستقیم پر چلنا ہوگا، اور جو لوگ اپنی خواہش کا اتباع چھوڑ دیں اور وہ خدا کی صراطِ مستقیم کے پیرو بن جائیں، وہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے دنیا کی سعادت بھی مقدر ہے اور آخرت کی سعادت بھی۔

سنتِ رسول کے خلاف

1947 کے بعد کشمیر میں پُرشور کشمیری جدوجہد شروع ہوئی۔ ابتداءً وہ جلسہ جلوس اور پر امن مظاہرہ کی شکل میں تھی، مگر اِن کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اِس کے بعد کشمیریوں میں تشدد کا مزاج پیدا ہوگیا۔ اکتوبر 1989 میں کشمیریوں نے پر امن طریقِ کار کو چھوڑ کر مسلح طریقِ کار کا راستہ اختیار کرلیا۔ اب ہر طرف گن کلچر اور بم کلچر نظر آنے لگا۔

کشمیری تحریک کے اِس نئے موڑ سے صرف چند ماہ پہلے میں سری نگر گیا تھا۔ وہاں 29 جون 1989 کو سری نگر کے ٹیگور ہال میں میری ایک تقریر ہوئی۔ اِس تقریر کا آڈیو کیسٹ اب بھی موجود ہے۔ اِس تقریر میں، میں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ بیان کیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ ایک عرب بدو مدینہ آیا۔ وہاں اس نے مسجد نبوی کو گندا کردیا۔ صحابہ نے اس کو پکڑ کر اس کی سرزنش کرنا چاہا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اس سے منع کردیا۔ آپ نے کہا کہ جہاں اس نے گندا کیا ہے، وہاں تم پانی بہا کر اس کو صاف کردو۔ (صحیح البخاري، رقم الحدیث: 5679)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس سلوک کا عرب بدو پر بہت زیادہ اثر ہوا۔ اِس کے بعد اس نے اپنے قبیلے میں جا کر لوگوں کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا تو اس کا قبیلہ اتنا متاثر ہوا کہ جلد ہی پورا قبیلہ اسلام کے دائرے میں داخل ہوگیا۔ اِس واقعے کو بیان کرنے کے بعد میں نے کہا کہ یہ پیغمبر اسلام کا طریقہ ہے۔ پیغمبر اسلام نے اپنا مقصد پانی بہا کر حاصل کیا تھا، آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنا مقصد خون بہا کر حاصل کریں۔ ایسا ہونا خدا کی اِس دنیا میں کبھی ممکن نہیں۔

بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ 29 جون 1989 کو اللہ کی توفیق سے جو الفاظ میں نے کہے تھے، وہ کشمیر میں ایک واقعہ بن گئے۔ کشمیریوں کی مسلح جدوجہد سے صرف اُن کے نقصان میں اضافہ ہوا، اس سے ان کو کوئی مثبت فائدہ حاصل نہ ہوسکا۔ اب آخری وقت آ گیا ہے کہ کشمیر کے مسلمان یوٹرن (U-turn) لیں، وہ پرتشدد قومی جدوجہد کے بجائے پرامن دعوتی جدوجہد کو اپنا نشانہ بنائیں۔

تاریخ کو انتظار ہے

قرآن کی سورہ یونس میں یہ آیت آئی ہے: واللہ یدعوا إلی دار السلام (10:25) یعنی اللہ بلاتا ہے امن کے گھر کی طرف:

And God calls to the home of peace.

اِسی طرح، قرآن کی سورہ آل عمران میں یہ آیت آئی ہے: أفغیر دین اللہ یبغون، ولہ أسلم مَن في السماوات والأرض طوعاً وکرھاً، وإلیہ یُرجعون (3:83) یعنی کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں، حالاں کہ اللہ کے دین کے تابع ہے، وہ سب کچھ جو زمین اور آسمان میں ہے، اور

سب کو اُسی کی طرف لوٹتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا مطلوب دین امن کا دین ہے۔ ستاروں اور سیاروں کی دنیا میں کامل امن قائم ہے۔ اِسی طرح، نباتات اور حیوانات کی دنیا میں بھی امن کا کلچر موجود ہے۔ یہی امن کا کلچر انسان سے بھی مطلوب ہے۔ اسلام کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اِس امن کلچر پر قائم ہوں، کیوں کہ تمام مثبت سرگرمیاں اُسی سماج میں کامیابی کے ساتھ جاری ہوتی ہیں جہاں امن کا ماحول قائم ہو۔ موجودہ زمانے میں ایک طرف، عالمی میڈیا کا دور آیا۔ دوسری طرف یہ ہوا کہ عین اِسی زمانے میں ساری دنیا کے مسلمان جہاد کے نام پر مسلح جدوجہد (armed struggle) میں مشغول ہوگئے۔ اِن سرگرمیوں کا یہ منفی نتیجہ نکلا کہ ساری دنیا میں اسلام، تشدد کا مذہب (violent religion) سمجھا جانے لگا۔

یہ بے حد سنگین صورتِ حال ہے۔ اِس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اسلام کی اِس منفی تصویر (negative image) کو بدلا جائے۔ عالمی میڈیا کو امیج بلڈنگ (image building) کا ذریعہ بنایا جائے، یعنی اسلام کو اِس حیثیت سے نمایاں کیا جائے کہ وہ لوگوں کو مذہبِ تشدد (religion of violence) کے بجائے، مذہبِ امن (religion of peace) نظر آنے لگے۔

اب آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمانوں میں کم از کم کوئی ایک گروہ ایسا اٹھے جو اسلام کی متشددانہ تصویر کو بدلے، جو اِس بات کا ذریعہ بنے کہ خدا کا دین لوگوں کو امن اور رحمت کا دین دکھائی دینے لگے، جو اب تک لوگوں کو صرف نفرت اور تشدد کا دین نظر آرہا ہے۔ یہ موجودہ زمانے کی ایک عظیم ترین سعادت ہے۔ جو مسلم گروہ اِس سعادت کا حق دار بنے گا، وہ بلاشبہہ دنیا اور آخرت میں اللہ کے عظیم انعامات کا مستحق قرار پائے گا۔ اِس مقصد کو کوئی ایسا مسلم علاقہ انجام دے سکتا ہے جو بروقت عالمی میڈیا میں آچکا ہو۔ موجودہ زمانے میں کئی ایسے مسلم علاقے ہیں جو عملاً عالمی میڈیا میں آچکے ہیں۔ لیکن حالات بتاتے ہیں کہ غالباً صرف ایک مسلم علاقہ ہے جو اِس واقعے کو ظہور میں لاسکتا ہے۔

راقم الحروف کے اندازے کے مطابق، یہ علاقہ ریاست جموں و کشمیر ہے۔ مختلف اسباب سے یہ علاقہ بالفعل عالمی میڈیا میں آچکا ہے۔ مگر ابھی وہ متشددانہ اسلام (violent Islam) کے اعتبار سے، عالمی میڈیا میں ہے۔ اب جو کچھ کرنا ہے، وہ صرف یہ کہ اہلِ کشمیر اپنی اِس حیثیت کو دریافت کریں اور اس کو مثبت معنوں میں وہ اسلام کی امیج بلڈنگ کے لیے استعمال کریں۔

یہ عظیم سعادت اہلِ کشمیر کو اُس وقت حاصل ہوگی، جب کہ وہ اپنے ہتھیاروں کو دریا میں پھینک دیں، اور اعلان کے ساتھ دنیا کو یہ بتادیں کہ اب انھوں نے متشددانہ کلچر کو چھوڑ دیا ہے۔ اب انھوں نے سوچ سمجھ کر پُرامن طریقہ اختیار کرلیا ہے، جو کہ اصل اسلام کا طریقہ ہے۔ اہلِ کشمیر کا یہ فیصلہ فی الفور عالمی میڈیا کے لیے ایک بریکنگ نیوز (breaking news) بن جائے گا۔ یہ ایک عظیم کریڈٹ ہے جو کسی مستحق گروہ کا انتظار کررہا ہے، اور اہلِ کشمیر بلاشبہہ یہی گروہ بن کر اِس کریڈٹ کا استحقاق حاصل کرسکتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (632ء) کے بعد وہ حالات پیدا ہوگئے۔ جب کہ عرب میں اسلام کی امیج (image) اُس سے مختلف نظر آنے لگی جو کہ پیغمبر اسلام کے زمانے میں تھی۔ اُس وقت حضرت ابو بکر صدیق اٹھے۔ انھوں نے کہا: **أینقص الدین، وأنا حيٌّ (هداية الرُواة لابن حجر العسقلاني، رقم الحديث: 3031)** کیا دین میں نقص آئے گا، حالاں کہ میں زندہ ہوں۔ اِس کے بعد اللہ تعالیٰ کی مدد آئی اور حالات بہت جلد درست ہوگئے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اہلِ کشمیر کھڑے ہو کر یہ کہیں کہ — ہم اِس بات کو برداشت نہیں کرسکتے کہ اسلام کو تشدد کا مذہب سمجھا جائے۔ ہم دوبارہ دنیا کو بتائیں گے اسلام رحمت اور امن کا مذہب ہے۔ جس دن اہلِ کشمیر متحد ہو کر یہ کہیں گے، اُسی دن اللہ کی مدد ٹوٹ پڑے گی اور اسلام دوبارہ مذہبِ امن کی حیثیت سے عالمی سطح پر اپنی جگہ حاصل کرلے گا۔

کشمیر دھماکہ

(Kashmir explosion)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 622 عیسوی میں مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ ہجرت سے پہلے آپ نے فرمایا تھا کہ: **أمرت بقریة تأکل القری، یقولون یثرب، وهي المدینة (صحیح البخاري، رقم الحدیث: 1748)** یعنی مجھ کو ایک ایسی بستی کا حکم دیا گیا ہے جو تمام بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں، اور وہ مدینہ ہے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ مدینہ کے لیے اللہ نے مقدر کیا تھا کہ وہ دعوتِ توحید کے لیے فلیش پوائنٹ (flash-point) بنے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا، مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد توحید کا دین (اسلام) بہت جلد ایک عالمی دین بن گیا۔

موجودہ زمانے میں اسلام کی تصویر (image) ایک متشددانہ مذہب کی بن گئی ہے۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں، اسلام کی یہی منفی تصویر ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اب اکیسویں صدی میں آخری طور پر وہ وقت آ گیا ہے جب کہ اسلام کی پر امن تصویر دنیا کے سامنے آئے۔ میڈیا کے دور میں اِس مقصد کے لیے ایک بریکنگ نیوز (breaking news) درکار ہے۔ سپر بریکنگ نیوز ہی اکیسویں صدی میں، اسلام کو دوبارہ ایک پر امن مذہب کی صورت میں دنیا کے سامنے نمایاں کر سکتی ہے۔

غور کیا جائے تو آج کی دنیا میں کشمیر وہ واحد مقام ہے جہاں سے اِس بریکنگ نیوز کا آغاز ہوسکتا ہے۔ پچھلے برسوں میں کشمیر میں اسلام کے نام پر متشددانہ تحریک چلی، تاہم اس کا ایک مثبت پہلو ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ہوا کہ میڈیا کے دور میں کشمیر عالمی نیوز میں آ گیا۔ اب اگر کشمیر میں پُرامن اسلام کی دعوت ابھرے تو اچانک یہ ہوگا کہ کشمیر عالمی میڈیا کے لیے ایک بریکنگ نیوز بن جائے گا۔ کشمیر وہ مقامِ تعارف بن جائے گا جہاں سے دنیا کو اِس واقعہ کی خبر ملے کہ اسلام امن کا مذہب ہے، وہ تشدد کا مذہب نہیں۔ حالات بتاتے ہیں کہ کشمیر کے لیے اِس کریڈٹ کا ملنا مقدر ہو چکا ہے۔ آج اسلام کو ایک پُرامن دھماکہ (peaceful explosion) کی ضرورت ہے۔ حالات بتاتے ہیں کہ غالباً کشمیر وہ مقام ہے جس کے لیے یہ مقدر ہے کہ وہ اکیسویں صدی میں اسلام کے اِس پر امن دھماکے کا مقام بنے۔ یہ بلاشبہہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کا تاریخ کو آج سب سے زیادہ انتظار ہے۔

امن کی اہمیت

قرآن کی سورہ النساء میں ارشاد ہوا ہے: **الصلح خیر** (4: 128) یعنی صلح زیادہ بہتر ہے۔ صلح کیا ہے، صلح دراصل امن کے نتیجے کا دوسرا نام ہے۔ جہاں صلح ہے، وہاں امن ہے اور جہاں صلح نہیں، وہاں امن بھی نہیں۔ اِس اعتبار سے، یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام میں امن کو خیر اعلیٰ کا درجہ حاصل ہے۔

عام طور پر لوگ انصاف (justice) کو بڑی چیز سمجھتے ہیں، مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ انصاف کی حیثیت صرف ایک تصوراتی معیار کی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ یہ تصوراتی معیار عملاً کس طرح حاصل ہو۔ اِس کا جواب صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ امن کے ذریعے۔ امن کا یہ فائدہ ہے کہ اس کے ذریعے مواقع کھلتے ہیں۔ انصاف کسی کو خود بخود نہیں ملتا۔ انصاف کسی گروہ کو صرف اُس وقت ملتا ہے، جب کہ وہ مواقع

کو پہچانے اور اس کو دانش مندانہ طور پر استعمال (avail) کرے۔

موجودہ زمانے میں بہت سے مقامات ہیں جہاں لوگ انصاف کے لیے لڑ رہے ہیں، مگر اِن میں سے ہر ایک اپنا مطلوب انصاف پانے میں ناکام ہے۔ اِس کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ ہے طریقِ کار (method) کی غلطی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اِس دنیا میں ساری اہمیت طریقِ کار کی ہے۔ کوئی صحیح مقصد بھی غلط طریقِ کار کے ذریعے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اصول اتنا زیادہ عام ہے کہ اس میں اہلِ کشمیر یا کسی غیر اہلِ کشمیر کا کوئی استثنا (exception) نہیں۔

کوئی گروہ جو انصاف کا طالب ہو، اُس کو سب سے پہلے اپنے یہاں امن قائم کرنا چاہیے۔ امن کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اُس کو ہر حال میں قائم کرنا ضروری ہے، خواہ اس کی کوئی بھی قیمت دینی پڑے۔ امن کبھی دوطرفہ بنیاد پر قائم نہیں ہوتا، امن ہمیشہ یک طرفہ صبر کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اِس کے سوا، امن کے قیام کا کوئی اور طریقہ نہیں۔

فطرت کا نظام، مواقع (opportunities) پر مبنی ہے۔ فطرت کے نظام کے تحت ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ مواقع وافر مقدار میں موجود رہتے ہیں۔ نفرت اور تشدد کا ماحول اِن فطری مواقع کے لیے ٹریپ ڈور (trap door) کی حیثیت رکھتا ہے۔ فطرت کا تقاضا ہے کہ آدمی سب سے پہلے نفرت اور تشدد کے ٹریپ ڈور کو ہٹائے۔ اِس ٹریپ ڈور کے ہٹتے ہی مواقع ایک سیلاب کی طرح امڈ پڑتے ہیں۔ یہ مواقع اپنی نوعیت کے اعتبار سے، سیکولر بھی ہوتے ہیں اور دینی بھی۔

مواقع کا سیکولر استعمال یہ ہے کہ لوگ تعلیم اور اقتصادیات جیسے تعمیری شعبوں میں سرگرم ہوجائیں اور کھلے ہوئے مواقع کو استعمال کرکے وہ ہر قسم کی ترقیاں حاصل کریں۔ مواقع کا دینی استعمال یہ ہے کہ اہلِ ایمان اِن مواقع کو دعوت الی اللہ کے لیے استعمال کریں، وہ دعوت کے مشن میں سرگرم ہو کر اپنے آپ کو اعلیٰ خدائی انعامات کا مستحق بنائیں — اس معاملے میں اہلِ کشمیر کو خصوصی حیثیت حاصل ہے۔ اُن کے لیے یہ عظیم موقع ہے کہ وہ اپنی ریاست میں امن قائم کریں اور لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچا کر، خدا کے عظیم انعامات کے مستحق بنیں۔

کشمیر کا مستقبل

1947 کے بعد ریاست جموں و کشمیر ایک پرابلم اسٹیٹ (problem state) بن گیا۔

انسائکلو پیڈیا برٹانکا (1984) نے اِس واقعے کو تاریخ کا اتفاق (accident of history) بتایا ہے (EB 9/32)۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ 1947 کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں جو کچھ ہوا، وہ سادہ معنوں میں صرف ''تاریخ کا اتفاق'' نہ تھا، بلکہ وہ خدا کا ایک فیصلہ (verdict of God) تھا۔ بظاہر اِس اتفاقی واقعے کے پیچھے خدا کی ایک عظیم مصلحت نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ اکیسویں صدی میں، ریاست جموں وکشمیر اِس حقیقت کا عنوان بنے کہ اسلام تشدد کا مذہب نہیں، اسلام پورے معنوں میں، امن کا مذہب ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ مسائل (problems) انسانی زندگی میں ہمیشہ مثبت رول ادا کرتے ہیں۔ مسائل کے بغیر انسانی زندگی جمود (stagnation) کا شکار ہوجاتی ہے۔ مسائل کسی انسانی گروہ کو، تخلیقی گروہ (creative group) بناتے ہیں۔ مسائل، انسانوں کے اندر نئی سوچ پیدا کرتے ہیں۔ مسائل ہمیشہ بہتر مستقبل کی تمہید ہوتے ہیں۔ مسائل کی حیثیت زندگی میں، زحمت میں رحمت (blessing in disguise) کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے ساتھ جو مسائل پیش آئے، وہ اس کی بہتری کے لیے تھے، اور یہ بہتری ریاست میں اب واقعہ بنتے ہوئے نظر آرہی ہے۔

واقعات بتاتے ہیں کہ جموں وکشمیر کے حالات نے وہاں کے لوگوں کے اندر اپنے بارے میں نظر ثانی کا ذہن پیدا کیا ہے۔ اب ریاست کے لوگ پہلے کے مقابلے میں، زیادہ حقیقت پسند ہوگئے ہیں۔ انھوں نے تشدد کے بجائے امن کی طرف اپنا نیا سفر شروع کردیا ہے۔ وہ منفی سوچ (negative thinking) سے باہر آگئے ہیں، اور وہ مثبت سوچ (positive thinking) کی اہمیت کو سمجھنے لگے ہیں۔ ماضی کے تجربے کی روشنی میں، انھوں نے رومانوی سیاست کو چھوڑ دیا ہے، اور حقیقت پسندانہ تعمیر کے راستے پر اپنا نیا سفر شروع کردیا ہے۔ انھوں نے بے فائدہ ہنگاموں کے بجائے، نتیجہ خیز عمل کا راز دریافت کرلیا ہے — یہ اعلیٰ اوصاف بلاشبہہ کشمیر کے لیے ایک روشن مستقبل کی ضمانت ہیں۔

امن کی طاقت زیادہ

2 دسمبر 2009 کی شام کو دہلی میں ایک تعلیم یافتہ مسلمان مسٹر بٹ سے ملاقات ہوئی۔ وہ الرسالہ مشن سے پوری طرح متفق ہیں۔ وہ آج کل افغانستان میں رہتے ہیں۔ وہ وہاں اسلام اور امن کے موضوع پر کام کررہے ہیں۔ وہ پشتو اور فارسی زبان اچھی طرح جانتے ہیں۔ اِس لیے وہ کامیابی کے ساتھ وہاں پُرامن

دعوت کا مشن پھیلا رہے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ ایک بار ان کی ملاقات کچھ افغانی انتہا پسندوں سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے افغانی انتہا پسندوں سے کہا کہ آپ لوگ خود کش بم باری کیوں کرتے ہیں۔ افغانی انتہا پسندوں نے کہا کہ ہمارے دشمن کے پاس جو ہتھیار ہے، اُس کا جواب ہمارے پاس نہیں، اِس لیے ہم مجبور ہو کر خود کش بم باری کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ آپ کے پاس جو ہتھیار ہے، اس کا جواب اُن کے پاس نہیں۔ فارسی زبان میں یہ گفتگو اِس طرح تھی:

افغانی : جوابِ اسلحۂ آنہا پیشِ ما نیست

مسٹر بٹ : جوابِ اسلحۂ شُما پیشِ آنہا نیست

انھوں نے کہا کہ آپ تشدد کی طاقت استعمال کررہے ہیں، لیکن اسلام کے مطابق، امن کی طاقت اُس سے زیادہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **إنَّ اللہ یعطی علی الرّفق، مالا یعطی علی العنف (صحیح مسلم، رقم الحدیث: 2593)** یعنی خدا پُرامن عمل پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ متشددانہ عمل پر نہیں دیتا۔ اِس معاملے کی عملی مثال اسلام کی ابتدائی تاریخ میں موجود ہے۔ احد کا غزوہ 3 ہجری میں پیش آیا۔ اِس میں مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اِس کے بعد 6 ہجری میں آپ نے فریقِ ثانی سے امن کا معاہدہ کرلیا، جو معاہدۂ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ گویا وائلنٹ ایکٹوزم کے بجائے پیس فل ایکٹوزم کو اختیار کرنا تھا۔ اِس کا نتیجہ، قرآن کے الفاظ میں، فتح مبین (48: 1) کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ متشددانہ بم پر نظریاتی بم کی برتری کی ایک مثال ہے۔

چشمے کا سبق

کشمیر کے ایک سفر میں، میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ میں کچھ کشمیری ساتھیوں کے ہم راہ شہر سے باہر گیا۔ وہاں کھلی ہوئی وادی تھی۔ سامنے کے پہاڑ سے چشمے بہہ کر آرہے تھے اور وادی میں بہتے ہوئے وہ آگے کی طرف چلے جارہے تھے۔ اِن چشموں کے راستے میں بار بار پتھر کے ٹکڑے آرہے تھے، لیکن چشمہ ان پتھروں سے ٹکرائے بغیر اپنا راستہ بدل کر آگے کی طرف بڑھ جاتا تھا۔ میں وہاں بیٹھ گیا اور خاموشی کے ساتھ بہتے ہوئے چشمے کے اِس منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اپنے کشمیری ساتھیوں سے کہا کہ دیکھئے، پانی

کے یہ چشمے ٹکراؤ سے بچتے ہوئے اپنا سفر جاری کئے ہوئے ہیں۔ اگر آپ چاہیں کہ اِس کے برعکس، آپ ٹکراؤ کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کریں تو آپ کبھی اِس میں کامیاب نہ ہوسکیں گے، یہ خدا کا قانون ہے اور خدا کے قانون میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی (35: 43)۔

پھر میں نے کہا کہ اِس دنیا میں خدا کا قانون عدم ٹکراؤ کے اصول پر قائم ہے۔ خلا کے تمام ستارے اور سیارے ایک دوسرے سے ٹکرائے بغیر اپنا سفر طے کرتے ہیں۔ اِس دنیا کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ کوئی تعمیری مقصد صرف پُرامن طریقِ کار کے ذریعے حاصل ہو، اِس دنیا میں پرتشدد طریقِ کار کے ذریعے کوئی بھی مفید نتیجہ حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے کہا کہ اہلِ کشمیر نے 1947 کے بعد اپنے مقصد کے حصول کے لیے جو طریقہ اختیار کیا، وہ نفرت اور تشدد کا طریقہ تھا۔ ایسا طریقہ خدا کی اِس دنیا میں مکمل طور پر ایک غیر فطری طریقہ ہے۔ ایسے کسی طریقے کے لیے پیشگی طور پر فطرت کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ اِس دنیا میں کبھی کامیاب نہ ہو۔

جمعہ کا دن، فساد کا دن

ایک کشمیری مسلمان سے ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ میں نے قرآن کو پڑھا ہے۔ قرآن کی سورہ الجمعہ میں بتایا گیا ہے کہ: اے مسلمانو، جب تم جمعہ کی نماز پڑھ لو تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور تم اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو، تا کہ تم کامیاب ہو:

> When the prayer is ended, then disperse in the land and seek of God's grace, and remember God much, that you may be successful (62: 10)

قرآن کی اِس آیت کا حوالہ دیتے ہوئے مذکورہ ہندو نے کہا کہ آپ کے قرآن میں یہ لکھا ہوا ہے کہ آپ جمعہ کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلیں تو آپ، لوگوں کو خدا کی رحمت بانٹیں، اور آپ لوگوں کا حال یہ ہے کہ آپ جمعہ کی نماز پڑھ کر نکلتے ہیں تو آپ نعرہ اور جلوس کی سیاست چلاتے ہیں، نفرت کی باتیں کرتے ہیں اور لوگوں کے اوپر پتھر پھینکتے ہیں۔ ایسا کر کے آپ لوگ خود اپنے دین کے خلاف کام کر رہے ہیں۔

یہ تبصرہ صرف کشمیر کے مسلمانوں پر نہیں، بلکہ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں پر صادق آتا ہے۔ آج کل ہر ملک کے مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ انھوں نے جمعہ کے دن کو نفرت اور تشدد کی باتوں کا دن بنا لیا ہے۔ اُن کا تقریباً ہر رہنما جمعہ کے اجتماع کو اپنے سیاسی مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

یہ بہت خطرناک علامت ہے۔ یہ خدا کے دین کو اپنے قومی اور سیاسی مقصد کے لیے استعمال کرنا ہے۔ یہ عین وہی چیز ہے جس میں یہود اپنے دورِ زوال میں مبتلا ہوئے۔ قرآن کے مطابق، یہ روش یہود کے لیے خدا کے غضب کا سبب بنی۔ اگر مسلمان اِس روش کو اختیار کریں تو وہ یقینی طور پر اس کے شدید انجام سے بچ نہیں سکتے۔ اِس معاملے میں کسی بھی قوم کا کوئی استثنا نہیں۔

عمر ضائع ہوگئی

کشمیر کے ایک مشہور عالم کا واقعہ ہے۔ ان کو ''مفکرِ کشمیر'' کہا جاتا تھا۔ وہ کشمیر کی سیاسی تحریک میں ایک رہنما کی حیثیت سے شامل تھے۔ 13 دسمبر 1990 کو کشمیر میں ان کو کچھ مسلم نوجوانوں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 87 سال تھی۔

28 نومبر 2011 کی ایک ملاقات میں کشمیر کے ایک مسلمان نے مجھ کو بتایا کہ مذکورہ عالم کی وفات سے کچھ پہلے انھوں نے راقم الحروف کی کتاب ''الاسلام'' اُن کو پڑھنے کے لیے دی تھی۔ بعد کی ایک ملاقات میں مذکورہ عالم نے کہا کہ مجھے اِس کتاب سے پورا اتفاق ہے۔ اِس کتاب کو پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنی ساری عمر ضائع کر دی۔ کاش، یہ کتاب مجھے پہلے مل گئی ہوتی۔

مذکورہ عالم کا یہ قول اہل کشمیر کے لیے اُن کی طرف سے ''کلمۂ باقیہ'' (آخری نصیحت) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مذکورہ عالم کی زندگی میں اہلِ کشمیر نے اُن کے سیاسی مشورے کو اختیار کیا تھا۔ اب اہلِ کشمیر کو چاہیے کہ وہ اسی طرح ان کے اسلامی مشورے کو اختیار کرلیں، یعنی اہلِ کشمیر تشدد کا طریقہ چھوڑ کر امن کا طریقہ اختیار کرلیں۔ وہ سیاست کے طریقے کو چھوڑ کر پُرامن دعوت کا طریقہ اختیار کرلیں۔ ایک فارسی شاعر کی زبان سے مذکورہ عالم کی روح اہلِ کشمیر سے کہہ رہی ہے کہ — میں سیاست سے پرہیز نہ کرسکا، تم لوگ سیاست سے پرہیز کرو: من نہ کردم، شما حذر بہ کنید!

جنت کا دروازہ

شہنشاہ جہاں گیر (وفات: 1627) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ کشمیر گیا۔ کشمیر کے خوب صورت مناظر کو دیکھ کر جہاں گیر نے کہا — دنیا میں اگر کوئی جنت ہے تو وہ صرف کشمیر ہے:

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

یہ شعر اس مفہوم میں درست نہیں کہ کشمیر خود جنت الفردوس کی حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ ایک اور معنی میں یہ شعر درست ہے، وہ یہ کہ کشمیر قدرت کی طرف سے مہیا کردہ ایک پوائنٹ آف ریفرنس (point of reference) ہے۔ اِس پوائنٹ آف ریفرنس کے حوالے سے کوئی شخص جنت کی پہچان حاصل کرسکتا ہے اوراس کے حوالے سے کوئی شخص اپنے آپ کو جنت میں داخلے کا مستحق بنا سکتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ جنت کو جب جنت کی نعمتیں ملیں گی تو وہ کہیں گے کہ ایسا ہی رزق ہم کو دنیا میں ملا تھا، اور جنت کا رزق دنیا کے رزق کے متشابہہ ہوگا:

> Whenever, they are given fruit to eat, they will say, 'This is what we were provided with before', they were given similar things.(2: 25)

موجودہ دنیا اپنی تخلیق کے اعتبار سے، جنت کا تعارف ہے (47: 6)۔ جنت کی دنیا ایک مکمل دنیا (perfect world) ہے، اور موجودہ دنیا جنت کی مانند ایک غیر مکمل دنیا (imperfect world)۔ یہ بات پورے سیارۂ ارض کے لیے درست ہے۔ تاہم، زمین کے بعض مقامات ایسے ہیں جہاں زمین کی یہ حیثیت بہت زیادہ نمایاں ہے۔ یہ زیادہ ممتاز طور پر جنت کی یاد دلانے والی ہے۔ انھیں مقامات میں سے ایک مقام بلاشبہہ ریاست جموں وکشمیر ہے۔ کشمیر کو درست طور پر ''کشمیر، جنت نظیر'' کہا جاتا ہے۔

ایک آدمی جس کے اندر جنت کا شعور زندہ ہو، وہ جب کشمیر کے خوب صورت مناظر کو دیکھے گا تو وہ پکار اٹھے گا کہ — خدایا، تو نے مجھے عارضی جنت کا منظر دکھا دیا، اب تو مجھے ابدی جنت میں داخل کردے۔ اِس اعتبار سے، کشمیر بلاشبہہ ایک عظیم پوائنٹ آف ریفرنس ہے۔ کشمیر کو دیکھ کر ایک باشعور انسان وہ دعا کرسکتا ہے جس کو حدیث میں، اسمِ اعظم کے ساتھ دعا کرنا کہا گیا ہے۔

مگر اس دعا کے لیے موافق ماحول ضروری ہے۔ نفرت اور تشدد کے ماحول میں کسی کے اندر یہ ربانی دعا ابل نہیں سکتی۔ کشمیر میں نفرت اور تشدد کا کلچر چلانے کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ کشمیر کو ایک عظیم نعمت سے محروم کردیا جائے۔ نفرت اور تشدد کے ماحول میں لوگوں کی زبان سے صرف بددعا نکلے گی، نہ کہ کوئی ربانی دعا۔ ایسے ماحول میں لوگوں کا دماغ منفی افکار کا جنگل بن جائے گا، جب کہ مذکورہ قسم کی اعلیٰ ربانی دعا کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کا دماغ مثبت افکار کا باغ بنا ہوا ہو۔

قرآن کے مطابق، جنت کامل معنوں میں ایک امن کی جگہ ہے (10: 25)۔ جنت گویا امن کلچر کا چمنستان ہے۔ ایسی جنت میں تشدد پسند لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تشدد اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک نفسیاتی آگ ہے۔ جو لوگ دنیا کی زندگی میں آگ والی نفسیات کے ساتھ جئیں، اُن کے لیے شدید اندیشہ ہے کہ وہ آخرت میں بھی آگ کی دنیا میں ڈال دئے جائیں۔

قرآن کے مطابق، جنت کے باشندے کامل طور پر امن پسند ہوں گے (36: 66)۔ وہاں ہر انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لیے صرف امن اور محبت کے جذبات ہوں گے۔ ایسی حالت میں جنت میں بسانے کے لیے صرف انھیں لوگوں کا انتخاب کیا جائے گا جنھوں نے موت سے پہلے کی دنیا میں اِس امن پسندانہ مزاج کا ثبوت دیا ہو۔ موجودہ دنیا ایک انتخاب گاہ (selection ground) ہے۔ موجودہ دنیا میں ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جا رہا ہے جو کامل طور پر امن پسند ہوں اور جنت کے پر امن سماج میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ یہ وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جو اہلِ کشمیر کو بھی سوچنے کی دعوت دیتی ہے، اور اِسی طرح دوسرے مقام کے لوگوں کو بھی۔

ناشکری کا کلچر

تشدد (violence) کیا ہے، تشدد ناشکری کا کلچر ہے۔ شکایت سے تشدد پیدا ہوتا ہے اور تشدد آدمی کے اندر سے شکر کی نفسیات کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیتا ہے۔ ابلیس نے آغازِ حیات میں چیلنج کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں انسانوں کو شکر کے راستے سے ہٹا دوں گا اور بیش تر انسانوں کو میں شکر نہ کرنے والا بنا دوں گا: **ولا تجد أكثرهم شاكرين** (7:17)۔

اِس اعتبار سے دیکھئے تو تشدد کوئی سادہ بات نہیں۔ جس سماج میں تشدد کا کلچر ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہاں کے لوگوں پر شیطان غالب آ گیا ہے۔ شیطان نے اُن کو بہکا کر، پہلے شکایت اور پھر تشدد کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ تشدد ایک شیطانی کلچر ہے، اور تشدد جہنم کا دروازہ کھولنے والا ہے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کیا تو ابلیس کو حکم دیا کہ وہ انسان کے آگے جھک جائے، مگر ابلیس، انسان کے آگے نہیں جھکا۔ ابلیس، جنات کا سردار تھا۔ ابلیس کو اُس وقت بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بہت سی چیزیں حاصل تھیں، مگر ایک چیز کے نہ ملنے پر وہ شکر کے راستے سے ہٹ

گیا۔ یہی ناشکری ہے، اور ناشکری بلاشبہہ ابلیس کی پیروی ہے۔

جب بھی کوئی فرد یا گروہ شکر کے راستے سے ہٹتا ہے اور نفرت اور تشدد کے راستے پر چلتا ہے تو اس کا سبب ہمیشہ کوئی ایک شکایت ہوتی ہے۔ اُس وقت بھی عملاً ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو 99 چیز ملی ہوئی ہوتی ہے، لیکن ایک چیز کے نہ ملنے کو وہ اتنا بڑا مسئلہ بنالیتا ہے کہ وہی ایک چیز اس کے دماغ پر چھا جاتی ہے۔ اسبابِ شکر کے ہجوم میں وہ شکایت کا جنگل بن جاتا ہے۔ یہ طریقہ بلاشبہہ شیطان کا طریقہ ہے، خواہ اس کو کتنے ہی خوب صورت الفاظ میں بیان کیا گیا ہو۔

کشمیر یا اِس طرح کے دوسرے مقامات پر جہاں مسلمان سیاسی شکایت کو لے کر بے فائدہ ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہیں، وہ سب اِس کی مثالیں ہیں۔ اِن مقامات پر ایسا نہیں ہے کہ مسلمان کلّی محرومی کا شکار ہو گئے ہوں۔ یہ لوگ کسی جزئی شکایت پر غیر ضروری طور پر حساس ہو گئے ہیں۔ یہی غیر ضروری حساسیت ان کا اصل مسئلہ ہے۔ اگر وہ اِس غیر ضروری حساسیت کو ختم کر دیں تو اچانک وہ محسوس کریں گے کہ ان کو اتنا زیادہ ملا ہوا ہے کہ انھیں شکر کی تحریک چلانا چاہیے، نہ کہ ناشکری اور شکایت کی تحریک۔

تشدد کی تزئین

تشدد (violence) کامل معنوں میں ایک تخریبی عمل ہے۔ پوری تاریخ بتاتی ہے کہ تشدد کے ذریعے کبھی بھی کسی فرد یا گروہ کو کوئی مثبت کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جب بھی کسی فرد یا گروہ نے تشدد کا طریقہ اختیار کیا تو اس کے حصے میں صرف تباہی آئی، نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی تعمیر۔ اِس کے باوجود کیوں ایسا ہے کہ لوگ بار بار تشدد کا فعل کرتے ہیں، لوگ بار بار متشددانہ کارروائی کرتے ہیں۔ اِس کا سبب شیطانی تزئین (Satanic beautification) ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ شیطان کا خاص طریقہ یہ ہے کہ وہ ایک غلط کام کو خوب صورت الفاظ میں پیش کرتا ہے، وہ فساد کو اصلاح کا نام دیتا ہے (15: 39)۔ اِس طرح شیطان لوگوں کے ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو اِس فرضی یقین میں مبتلا کرتا ہے کہ جو کچھ تم کرنے جا رہے ہو، وہ تشدد نہیں ہے، بلکہ وہ مقدس جہاد ہے۔ وہ شہادت کا راستہ ہے جو تم کو سیدھے جنت تک پہنچانے والا ہے۔ اِس طرح شیطانی تزئین کا شکار ہو کر لوگ تشدد کا عمل کرنے لگتے ہیں۔ وہ ایک غلط کام کر رہے ہوتے ہیں، لیکن شیطان اُن کو بتاتا ہے کہ یہ ایک اچھا کام ہے۔

اِس شیطانی تزئین سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، وہ یہ کہ اپنے عمل کو نتیجہ (result) کے اعتبار سے جانچا جائے۔ جو متشددانہ عمل تباہی کے انجام تک پہنچ رہا ہو، جس سے ملے ہوئے مواقع برباد ہوتے ہوں، اُس کے بارے میں یہ یقین کرلیا جائے کہ وہ شیطان کی تزئین کا نتیجہ ہے اور پھر توبہ واستغفار کرکے اُس سے دوری اختیار کرلی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ تشدد اپنے آپ میں ایک نا مطلوب فعل ہے۔ تشدد کبھی کوئی اصلاح پیدا نہیں کرتا، وہ صرف مزید نقصان کا سبب بنتا ہے۔ تشدد ایک حیوانی فعل ہے، وہ کوئی انسانی فعل نہیں۔ تشدد ہمیشہ نفرت اور عداوت سے پیدا ہوتا ہے۔ اپنے اندر سے نفرت اور عداوت کی سوچ کو ختم کردیجئے۔ اِس کے بعد کبھی شیطان آپ کے اوپر قابو نہ پاسکے گا۔ تشدد جیسے فعل سے آپ کامل طور پر محفوظ ہوجائیں گے۔

ملکہ سبا کا قصہ

قرآن کی سورہ النمل میں ملکہ سبا کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ملکۂ سبا کا زمانہ حضرت سلیمان کا زمانہ (932 ق م) ہے۔ اس کی حکومت قدیم یمن کے ساحلی علاقے میں قائم تھی۔ حضرت سلیمان، شام وفلسطین کے حکمراں تھے۔ حضرت سلیمان نے ایک مکتوب ملکہ سبا کو لکھا کہ تم یا تو سرینڈر کرو، یا ہماری فوج کشی کا سامنا کرو۔ اِس کے جواب میں ملکہ سبا نے سرینڈر کا طریقہ اختیار کیا۔ اِس کا سبب بتاتے ہوئے اُس نے کہا: ''بادشاہ لوگ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اس کو تباہ کردیتے ہیں اور وہ اس کے عزت والوں کو ذلیل کردیتے ہیں، اور یہی یہ لوگ کریں گے'' (27:34)۔

ملکہ سبا کے اِس واقعے سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب کسی ایسی صورت حال کا سامنا ہو جس میں ممکن انتخاب صرف دو چیزوں کے درمیان ہو — تباہی اور مصالحت، تو ایسی صورتِ حال میں، تباہی کے بجائے، مصالحت (adjustment) کا طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ اُس وقت یہی اسلام کا طریقہ ہوگا۔

ملکہ سبا نے معاملے کو خالص حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھا۔ اس نے یہ رائے قائم کی کہ اگر ہم سلیمان کی طاقت سے ٹکرائیں تو زیادہ امکان یہ ہے کہ ہم ہاریں گے اور پھر ہمارے ساتھ وہی کیا جائے گا جو ہر غالب قوم، مغلوب قوم کے ساتھ کرتی ہے۔ اِس کے برعکس، اگر ہم اطاعت قبول کرلیں تو ہم تباہی سے بچ جائیں گے۔ اِس طرح ہمارے تمام مفادات محفوظ رہیں گے۔

اِس واقعے میں ایسے تمام مسلمانوں کے لیے ایک سبق ہے جو کشمیر جیسی صورت حال سے دو چار ہیں۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ایسے مقامات کے مسلمانوں کی سیاسی پالیسی کیا ہونا چاہیے، وہ پالیسی یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو بے فائدہ ٹکراؤ سے بچائیں، تاکہ وہ حاصل شدہ مواقع کو استعمال کرسکیں۔ وہ ایسا نہ کریں کہ جو ملنے والا نہیں ہے، اُس کو پانے کی کوشش میں وہ ملے ہوئے کو بھی برباد کردیں۔

دورِ تشدد کا خاتمہ

دوسری عالمی جنگ (1939-1945) کے زمانے میں کئی ملکوں نے تشدد کا طریقہ اختیار کیا۔ مثلاً برطانیہ، جرمنی، جاپان، وغیرہ۔ مگر جنگ کے خاتمے پر اِن سب ملکوں نے جنگ کا طریقہ چھوڑ دیا اور پُرامن جدو جہد کا طریقہ اختیار کرلیا۔ یہ واقعہ کوئی سادہ واقعہ نہ تھا۔ یہ دراصل اِس بات کا اعلان تھا کہ اب انسانی تاریخ اُس مرحلے میں پہنچی ہے، جب کہ تشدد کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ اب انسان کے لیے صرف ایک ہی آپشن ہے اور وہ پرامن طریقِ کار کا آپشن ہے۔ کوئی بھی عمل نتیجہ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ جو عمل مثبت نتیجہ نہ پیدا کرے، وہ بلاشبہہ اِس قابل ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے۔ دوسری جنگ عظیم میں یہی واقعہ پیش آیا۔ جو قومیں اِس جنگ میں شریک تھیں، انھوں نے اِس جنگ میں جان ومال کی بے شمار قربانیاں دیں، مگر نتیجے کے اعتبار سے، یہ قربانیاں ہر ایک کے لیے لاحاصل ثابت ہوئیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ دورِ جدید میں جو ہتھیار ایجاد کئے گئے، وہ جنگ کے لیے مانع (deterrent) بن گئے ہیں، وہ جنگ کے لیے محرک (incentive) کی حیثیت نہیں رکھتے۔ مثال کے طور پر جرمنی اور جاپان نے دوسری عالمی جنگ میں، جنگ کا طریقہ اختیار کرکے بہت زیادہ نقصان اٹھایا تھا، لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد انھوں نے اپنی قومی جدو جہد کے لیے جنگ کا طریقہ چھوڑ دیا اور اس کے بجائے امن کا طریقہ اختیار کرلیا۔ اِس کے نتیجے میں دونوں ملکوں نے زبردست کامیابی حاصل کی۔ یہ کامیابی اِس کے باوجود ہوئی کہ جرمنی نے اپنے ملک کا ایک حصہ مشرقی جرمنی (East Germany) کھودیا تھا، اور جاپان اپنے ایک بڑے جزیرہ اوکی ناوا (Okinawa) سے محروم ہوگیا تھا۔

کشمیر اور دوسرے علاقے، جہاں مسلمان تشدد کی تحریک چلا رہے ہیں، اُنھیں اِن واقعات سے سبق لینا چاہیے۔ یہ واقعات محض کسی ملک کے واقعات نہیں ہیں، وہ فطرت کے قانون کو بتاتے ہیں۔

فطرت کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ نفرت اور تشدد کے راستے پر چلیں، اُن کے حصے میں آخر کار صرف محرومی آئے، اور جو لوگ امن اور محبت کے راستے پر چلیں، اُن کو ہر قسم کی کامیابی حاصل ہو۔

تخریبی سیاست

مغربی دنیا کے ایک مشہور مسلم مقرر نے وہاں کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ — ظالم حکمراں کے خلاف بغاوت، خدا کے لیے وفاداری ہے:

Rebellion to a tyrant, obedience to God.

یہ جملہ اسلام کی سیاسی تعبیر (political interpretation) کے تحت بننے والے ذہن کی نمائندگی کرتا ہے۔ مسلمانوں کی جدید نسل عام طور پر، اس سیاسی تعبیر سے متاثر ہے۔ آج کی دنیا میں جگہ جگہ اسلامی انقلاب کے نام پر جو ہنگامے جاری ہیں، وہ اِسی سیاسی فکر کا نتیجہ ہیں۔

اِس قسم کی نام نہاد انقلابی سیاست ہرگز اسلامی سیاست نہیں۔ اگر شدید لفظ استعمال کیا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ اسلام کے نام پر ایک شیطانی سیاست ہے۔ اِس سیاست کا بانیٔ اول خود شیطان ہے۔ آج جو لوگ اِس قسم کی سیاست کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں، وہ بلاشبہہ شیطان کی پیروی کررہے ہیں، نہ کہ اسلام کی پیروی۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ تخلیقِ انسانی سے پہلے جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا تو اُس وقت وہاں آدم کے سوا دو مخلوق اور موجود تھی — فرشتے اور جنات۔ اللہ نے حکم دیا کہ تم لوگ آدم کے آگے جھک جاؤ۔ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے اِس حکم کی تعمیل کی، لیکن ابلیس (جنات کا سردار) نے اللہ کے اِس حکم کو ماننے سے انکار کیا، وہ اللہ کا باغی بن گیا۔

یہ انسانی تاریخ میں، اتھارٹی (authority) کے خلاف بغاوت کا پہلا واقعہ تھا۔ یہ سیاسی بغاوت یا پالٹکس آف اپوزیشن (politics of opposition) بلاشبہہ شیطان کی سنت ہے۔ اتھارٹی سے ٹکرائے بغیر اپنا کام کرنا، یہ ملائکہ کا طریقہ ہے۔ اور اتھارٹی سے ٹکراؤ کرکے پالٹکس آف اپوزیشن کا ہنگامہ کھڑا کرنا، شیطان کا طریقہ۔ عجیب بات ہے کہ شیطان کی یہ منفی سیاست پوری تاریخ میں مسلسل طور پر جاری رہی ہے، اہلِ ایمان کے درمیان بھی اور غیر اہلِ ایمان کے درمیان بھی۔ اِسی منفی سیاست کا یہ نتیجہ ہے کہ انسانی تاریخ، تعمیر کی تاریخ بننے کے بجائے، تخریب کی تاریخ بن گئی۔

فطرت کے خلاف

انسانی زندگی میں تبدیلی لانے کے لیے جو سرگرمیاں کی جاتی ہیں، ان کو تحریک (movement) کہا جاتا ہے۔ اِس دنیا میں تحریک کی دو صورتیں ہیں— مبنی بر ذہن تحریک، مبنی بر نظام تحریک (mind-based activism, system-based activism)۔

تحریک کا وہ انداز جو فطرت کے مطابق ہے، وہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے— مبنی بر ذہن تحریک۔ اِس کے برعکس، مبنی بر نظام تحریک، فطرت کے یا خالق کے تخلیقی منصوبے کے خلاف ہے۔ اِس فرق کی بنا پر ہمیشہ ایسا ہوگا کہ مبنی بر نظام تحریک ہمیشہ ناکام ہوگی اور مبنی بر ذہن تحریک ہمیشہ کامیاب۔ آج کی دنیا میں جو نفرت اور تشدد پایا جاتا ہے، وہ صرف اِس قانونِ فطرت سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

موجودہ زمانے میں، کشمیر اور دوسرے مقامات پر جو تحریکیں چلائی گئیں، اُن میں سے کوئی تحریک ایسی نہیں ہے جو ذہن (mind) کو نشانہ بنا کر چلائی گئی ہو۔ وہ سب کی سب نظام (system) کو نشانہ بنا کر چلائی گئیں۔ اِس لیے اُن کا یہ منفی انجام ہوا کہ اِس طرح کی ہر تحریک کا نتیجہ صرف تباہی کی صورت میں برآمد ہوا— سیکڑوں سال کی روایات ٹوٹ گئیں، لوگوں کے درمیان نفرتیں پیدا ہوئیں جو آخر کار تشدد تک جا پہنچیں۔ باہمی خیر خواہی کا ماحول ختم ہو گیا، وغیرہ۔

مبنی بر نظام تحریک غیر فطری تحریک ہے۔ صحیح تحریک وہ ہے جو اصلاحِ ذہن کی بنیاد پر چلائی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام کا الگ سے کوئی وجود نہیں۔ انسان کے مجموعے ہی کا دوسرا نام نظام ہے۔ انسان اگر فرداً فرداً اصلاح یافتہ ہو جائیں تو اُن کے مجموعے سے جو نظام بنے گا، وہ فطری طور پر ایک اصلاحی نظام ہوگا۔ قانونِ فطرت کے مطابق، اصلاح کی تحریک فرد سے شروع ہوتی ہے، نہ کہ نظام سے۔ جو تحریک نظام کی اصلاح کے نام پر شروع کی جائے، وہ اپنے آغاز ہی سے دو طبقوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا کرے گی، اور جہاں نفرت اور ٹکراؤ پایا جائے، وہاں عملاً اصلاح کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔

صالح تحریک، غیر صالح تحریک

ہر آدمی کے اندر ایک شیطان چھپا ہوا ہے۔ یہ شیطان، نفرت کا بم (hate bomb) ہے۔ ہر آدمی امکانی طور پر نفرت کا بم اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ نفرت کا یہ بم عام حالات میں، انسان کے اندر سویا ہوا

ہوتا ہے۔لیکن اگرکسی طرح اُس کو جگا دیا جائے ،تو اچانک وہ بے پناہ ہو کر بھڑک اٹھتا ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ اِس معاملے میں کسی عورت یا مرد کا کوئی استثنا نہیں۔

اِس صورتِ حال کا مطلب دوسرے لفظوں میں، یہ ہے کہ ہر انسان ایک انتہائی آتش گیر (highly inflammable) مادّہ کی حیثیت رکھتا ہے۔کسی سماج میں اگردس ہزار آدمی ہیں،تو وہ گویا کہ دس ہزار چلتے پھرتے آتش گیر مادّے کا مجموعہ ہیں۔ یہ دراصل ذاتی مفاد (personal interest) ہے جولوگوں کومزاجاً متشدد ہونے کے باوجود، مجبورانہ طور پر امن پسند بنائے رہتا ہے۔ایسی صورت میں قیادت (leadership) کا کام ایک بے حد مشکل کام ہے۔جس قائد کے پاس صرف شکایت اوراحتجاج کا نعرہ ہو، اُس کو ہرگز میدان میں نہیں آنا چاہیے۔کیوں کہ اس کا منفی نعرہ لوگوں کو بھڑکائے گا اورآخرکار، سماج کا وہ حال ہوجائے گا، جیسے ایک مقام پر بہت سے آتش گیر مادّے ہوں اوروہ اچانک بھڑک اٹھیں۔

قائد پر لازم ہے کہ اگر اس کے پاس محبت کا نعرہ ہے، تب تو وہ اپنی تحریک لے کر سماج میں آئے۔ اور اگر اُس کے پاس صرف نفرت اور شکایت کی باتیں ہوں، تو اس کے لیے فرض کے درجے میں ضروری ہے کہ وہ اجتماعی تحریک ہرگز نہ شروع کرے۔ اس کے بجائے، وہ اپنے آپ کو اپنے گھر کے اندر محصور کرلے۔یہی اس کے لیے نجات کی واحد صورت ہے۔

اجتماعی تحریکیں دو قسم کی ہوتی ہیں— مثبت تحریک، اور منفی تحریک۔ مثبت تحریک وہ ہے جو ذاتی ذمّے داری (duty) کی بنیاد پر اٹھائی جائے۔ایسی تحریک ایک صالح تحریک ہے۔منفی تحریک وہ ہے جو حقوق طلبی اوراحتجاج کی بنیاد پر اٹھائی جائے۔ایسی تحریک ایک غیر صالح تحریک ہے۔صالح تحریک کا نتیجہ ہمیشہ اچھا نکلتا ہے،اورغیر صالح تحریک ہمیشہ بُرے انجام پر ختم ہوتی ہے۔

اصلاحی عمل کا نقطۂ آغاز

قدیم زمانے میں جب یہود پر سیاسی زوال آیا تو اُن کے اندر یہ مزاج پیدا ہوا کہ وہ لڑ کر دوبارہ فلسطین میں اپنا سیاسی اقتدار قائم کریں۔ اُس وقت، بائبل کے بیان کے مطابق، یہود کے پیغمبر یرمیاہ نے اُن سے کہا— بادشاہ اور اس کی والدہ سے کہو کہ عاجزی کرو اور نیچے بیٹھو، کیوں کہ تمھاری بزرگی کا تاج تمھارے سر پر سے اتارلیا گیا ہے:

Say to the king and to the queen mother, “Humble yourselves sit down, for your rule shall collapse, the crown of your glory.” (Jeremiah 13: 18)

یہاں یہود کی مثال کی صورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ قوموں پر عروج کے بعد زوال آتا ہے، سیاسی بالادستی کے بعد انھیں سیاسی زیردستی کا تجربہ ہوتا ہے۔ یہ معاملہ قانونِ فطرت کے تحت پیش آتا ہے۔ اُس وقت قوم کو چاہیے کہ وہ اِس تبدیلی کو تسلیم کرے۔ کیوں کہ اُس وقت اِس تبدیلی کو تسلیم نہ کرنا اپنے آپ کو مزید تباہی کی طرف لے جانے کے ہم معنیٰ ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی اقتدار (political power) کسی گروہ کی قومی اجارہ داری (monopoly) نہیں۔ سیاسی اقتدار کا حصول اس کی ضروری اہلیت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ قوم کے اندر جب تک صلاحیت پائی جائے، سیاسی اقتدار بھی اُس کو حاصل رہے گا۔ صلاحیت کے فقدان کے بعد سیاسی اقتدار بھی اس سے چھن جائے گا۔ جب ایسا ہو تو قوم کو چاہیے کہ وہ دوبارہ اپنے اندر ضروری صلاحیت پیدا کرے، نہ کہ وہ فریقِ ثانی کے خلاف بے فائدہ جنگ چھیڑ دے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ **مابقوم** میں تغیر ہمیشہ **مابأنفس** میں تغیر کا نتیجہ ہوتا ہے (13:11)۔ **مابقوم** سے مراد اجتماعی حالت ہے، اور **مابأنفس** سے مراد انفرادی حالت۔ جب بھی کسی قوم کی اجتماعی سطح پر زوال آئے تو اس کو اپنے افراد کی سطح پر اس کا سبب ڈھونڈنا چاہیے۔ کیوں کہ قوم کے افراد کی حالت کو بدلنے کے بعد ہی قوم کی اجتماعی حالت بدل سکتی ہے، اس کے بغیر ہرگز نہیں — عمل کا آغاز افراد کی سطح سے ہوتا ہے، نہ کہ اجتماع کی سطح سے۔ اجتماع کی سطح پر جو آغاز ہوتا ہے، وہ صرف لیڈری ہے، نہ کہ کوئی حقیقی عمل۔

کشمیریت کی طرف واپسی

کشمیریت کیا ہے، کشمیریت دراصل صوفیت کا دوسرا نام ہے۔ کشمیری کلچر کا مطلب ہے، صوفی کلچر۔ کشمیر شاید پوری دنیا میں واحد مقام ہے جہاں اسلام صرف صوفیوں کے ذریعے آیا اور صوفیوں کے ذریعے پھیلا۔ اِس لیے کشمیر میں کشمیریت کو قائم کرنا، دراصل صوفیت کو قائم کرنا ہے۔ صوفیت اور روحانیت دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ صوفیت تمام تر امن اور محبت سے عبارت ہے۔ صوفیت اِس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ امن اور محبت کے کلچر کا دوسرا نام ہے۔

صوفی کلچر کیا ہے، خود صوفیوں کی زبان میں، وہ صلحِ کُل (peace with all) کا نام ہے۔ یہی صوفی کلچر، مسلم اور مسلم کے درمیان بھی مطلوب ہے، اور مسلم اور غیر مسلم کے درمیان بھی۔

کشمیر کے لوگ پچھلے سیکڑوں سال سے اِسی صوفی کلچر پر قائم تھے۔ وہاں کا پورا ماحول امن اور محبت اور سماجی ہم آہنگی کے اصول پر مبنی تھا۔ کشمیر کے لوگ نفرت اور تشدد سے بالکل نا آشنا تھے۔ کچھ بیرونی عناصر نے کشمیر کے لوگوں کو بہکا کر اُن کو اِس کشمیری کلچر سے ہٹا دیا۔ نفرت اور تشدد کے کلچر نے کشمیریوں کو کوئی مثبت چیز نہ دی، البتہ اس کا نقصان یہ ہوا کہ کشمیریوں سے اُن کا سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ چھن گیا، اور وہ یہی صوفیانہ کلچر تھا جو ہمیشہ سے کشمیر کی علامت بنا ہوا تھا، یعنی امن اور محبت کا کلچر۔

یہ کشمیر کی خوش قسمتی تھی کہ پچھلے چند سو سالوں میں یہاں باہر سے جو مسلم صوفی آئے، یا مقامی طور پر جو صوفی پیدا ہوئے، وہ سب کے سب امن اور محبت کا پیغام دینے والے تھے۔ اِس کے نتیجے میں کشمیر میں زبردست اِنقلاب آیا۔ کشمیر میں اسلام کو غیر معمولی طور پر فروغ حاصل ہوا۔

مثال کے طور پر شیخ نور الدین نورانی (وفات: 1439ء) کشمیر کے صوفیوں میں سے ایک صوفی تھے۔ کشمیر کے لوگوں میں عام طور پر وہ ''علَم دارِ کشمیر'' کے نام سے مشہور تھے۔ ہندو لوگ انھیں پیار سے ''نند رشی'' کہتے تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔

شیخ نور الدین نورانی سچی کشمیریت کی علامت تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ — اگر تو دانش مند ہے تو ہندو اور مسلمان کو الگ الگ انسان نہ سمجھ، یہی خدا سے ملنے کا راستہ ہے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ چناں چہ ان کا کلام کشمیر کے ایک شاعر نے 'رشی نامہ' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ نور الدین نورانی کے نزدیک انسان کی ایک ہی پہچان تھی، وہ یہ کہ انسان انسان سے محبت کرے۔ ان کے نزدیک انسان سے محبت ہی خدا کی پہچان کا راستہ ہے۔

شیخ نور الدین نورانی کے قیمتی اقوال میں سے ایک قول کا مفہوم یہ ہے کہ — میں نے تلوار توڑ دی اور اُس سے درانتی بنالی۔ یہ قول شیخ نورانی کے فکر کا خلاصہ ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے لوہا بنایا جس میں خصوصی طاقت ہے، مگر لوہا اس لیے نہیں ہے کہ آپ اس کو تشدد کے لیے استعمال کریں، بلکہ آپ کو چاہیے کہ لوہے کو تعمیرِ انسانیت کے لیے استعمال کریں۔ آپ لوہے سے تلوار کے بجائے درانتی بنائیں جو زراعت

کے کام آتی ہے۔لیکن اکتوبر 1989 سے کشمیر میں ایسے لوگ اُبھرے جو برعکس اصول پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے برعکس طور پر یہ کیا کہ اپنی ''درانتی'' کو توڑ کر اُس سے ''تلوار'' بنالی۔ انھوں نے جہاد کے نام پر پوری ریاست میں نفرت اور تشدد پھیلا دیا۔

جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے، میں پہلے دن سے نام نہاد کشمیری تحریک کو بے اصل سمجھتا رہا ہوں۔ میرا کہنا یہ رہا ہے کہ اِس طرح کے واقعات تاریخ کے ذریعے ظہور میں آتے ہیں، نہ کہ موجودہ قسم کی تحریک کے ذریعے۔ میرا ماننا ہے کہ کشمیر کا فیصلہ انڈیا کی آزادی کے وقت ہی ہوچکا ہے۔ اب نہ اُس کو باقاعدہ جنگ کے ذریعے بدلا جاسکتا ہے اور نہ گوریلا وار کے ذریعے۔ اِس قسم کی ہر کوشش مکمل طور پر ناکام ہوچکی ہے۔ اُس کو مزید دہرانا، صرف اپنے نقصان میں اضافے کے ہم معنیٰ ہے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ انڈیا ہر اعتبار سے پاکستان سے بہت زیادہ ترقی کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں کشمیر کے لیے بہترین چوائس انڈیا ہے، نہ کہ پاکستان۔ حقیقت یہ ہے کہ انڈیا کے ساتھ جُڑنا، ایک ترقی یافتہ ملک کے ساتھ جڑنا ہے۔ اور پاکستان کے ساتھ جڑنا، ایک ایسے ملک کے ساتھ جڑنا ہے جو ابھی تک ترقی کی طرف اپنا سفر بھی شروع نہ کرسکا۔

1989 میں ملٹنسی (militancy) شروع ہونے سے پہلے، کشمیر کو وہاں کی زبان میں، ''پیروار'' (صوفیوں کی سرزمین) کہا جاتا تھا۔ کشمیر کے ایک مسلمان نے بڑے درد کے ساتھ کہا کہ پہلے کشمیریوں کا حال یہ تھا کہ وہ مرغی کو بھی ذبح کرنا نہیں جانتے تھے، مگر 1989 کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ وہ انسان کو ذبح کرنے لگے۔ بلبل شاہ اور شاہ ہمدان جیسے صوفیوں نے کشمیر میں جو کلچر رائج کیا، وہ مکمل طور پر امن کلچر تھا۔ کشمیری لوگ اپنے مزاج کے اعتبار سے تشدد سے بالکل ناواقف تھے۔ کشمیریوں کے اِس امن پسندانہ مزاج کو بتانے کے لیے ایک صوفی کا یہ شعر بالکل درست تھا:

ما قصۂ سکندر ودارا، نہ خواندہ ایم

از ما بجز حکایتِ مہر وفا مپرس!

مگر انسان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ اگر اس کو بھڑکایا جائے تو وہ بھڑک اٹھتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنے مفاد کی خاطر کشمیر میں یہی بھڑکانے کا کام کیا، مگر یہ وقتی تھا— واقعات بتاتے ہیں کہ کشمیر کے لوگ

اب اپنی اصل فطرت کی طرف واپس آرہے ہیں۔

اب آخری وقت آ گیا ہے کہ کشمیر کے لوگ ماضی کی طرف لوٹیں، وہ اپنے بھولے ہوئے سبق کو یاد کریں، وہ اپنی زندگی کو دوبارہ صوفیانہ روایت پر قائم کریں، وہ کشمیر کو دوبارہ امن اور محبت کا کشمیر بنا دیں، جیسا کہ وہ اپنے ماضی میں تھا۔ یہی کشمیریت ہے۔ اِسی کشمیریت کی طرف واپسی میں کشمیر کی ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

مشتے بعد از جنگ

1968 میں راقم الحروف نے کشمیر کی سیاست کے بارے میں ایک مضمون شائع کیا تھا۔ اِس مضمون کا ایک سبق آموز حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''اپنا حق وصول کرنے کا وقت وہ ہوتا ہے جب کہ فیصلے کا سِرا اپنے ہاتھ میں ہو، مگر ہمارے لیڈر اُس وقت ہوش میں آتے ہیں، جب کہ اُن کا کیس اخلاقی کیس بن چکا ہو— یہ احساس مجھے اکثر اُس وقت ہوتا ہے جب کہ میں کشمیری لیڈر شیخ محمد عبد اللہ کی تقریر پڑھتا ہوں۔ ان کی موجودہ سیاسی مہم مجھے 'مشتے بعد از جنگ' سے زیادہ نظر نہیں آتی۔ 1947 میں وہ اِس پوزیشن میں تھے کہ اگر وہ حقیقت پسندی اختیار کرتے تو وہ خود اپنی مرضی کے مطابق، اپنے حق میں فیصلہ لے سکتے تھے۔ مگر انھوں نے فیصلے کے وقت کو غیر حقیقت پسندانہ خوابوں میں کھو دیا۔ اب جب کہ فیصلے کا سرا اُن کے ہاتھ سے نکل چکا ہے تو اب وہ چیخ و پکار کر رہے ہیں، حالاں کہ اب اِس چیخ و پکار کی حیثیت محض اخلاقی دُہائی کی ہے، اور اخلاقی دہائی اِس دنیا میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔ قومی معاملات میں جب فیصلے کا سرا ایک بار ہاتھ سے نکل جائے تو مسئلہ بے حد سنگین ہو جاتا ہے۔ پھر تو زمین اور آسمان کی گردشیں ہی اُس کو بدل سکتی ہیں۔ قومی قیادت ایک ایسا کام ہے جو صرف اُن لوگوں کے کرنے کا ہے جو حال کے اندر مستقبل کو دیکھ سکیں۔ باقی وہ لوگ جن کی نگاہیں صرف ماضی اور حال تک جاتی ہوں اور مستقبل اُنھیں صرف اُس وقت نظر آئے جب کہ وہ واقعہ بن کر ان کے اوپر ٹوٹ پڑا ہو، ایسے لوگ قوموں کی قیادت نہیں کر سکتے، البتہ وہ اپنے غیر دانش مندانہ اقدامات سے قوموں کو مسائل میں الجھانے کا فرض ضرور انجام دے سکتے ہیں''۔ (الجمعیۃ ویکلی، دہلی، 8 جون 1968، صفحہ 4)

یہ الفاظ تقریباً 45 سال پہلے لکھے گئے تھے۔ اِن الفاظ کی واقعیت اب ایک ثابت شدہ حقیقت بن چکی ہے۔ اہلِ کشمیر کو اِس تجربے سے سبق لینا چاہیے۔ اُن کو یہ غلطی ہرگز نہیں کرنا چاہیے کہ وہ قدیم طرز کی

ناکام سیاست کو نئے نئے ناموں کے ساتھ بدستور جاری رکھیں۔ اب آخری وقت آگیا ہے جب کہ اہلِ کشمیر اپنے مستقبل کی تعمیر کے معاملے پر ازسرِ نو غور کریں اور حقائق کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنی قومی پالیسی کی ازسرِ نو تشکیل کریں۔ پالیسی وہی ہے جو عملاً پائدار (sustainable) ہو، جو پالیسی پائدار نہ ہو، وہ پالیسی ہی نہیں۔ وہ صرف وقت اور توانائی کا ضیاع ہے، نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی نتیجہ خیز عمل۔

زمانے کے خلاف

1947 کے بعد کشمیر میں جو تحریک چلائی گئی، اس کا مقصد تھا کشمیر کو علاحدہ پاکٹ بنانا۔ یہ بلاشبہہ ایک خلافِ زمانہ روش (anachronism) ہے۔ موجودہ زمانہ بین الاقوامی تعلقات کا زمانہ ہے۔ ایسی حالت میں، علاحدہ پاکٹ بنانا ایک خلافِ زمانہ روش کی حیثیت رکھتا ہے۔

اِس معاملے میں ایک عبرت ناک مثال پاکستان کی ہے۔ پاکستان اِسی علاحدگی کے تصور پر بنایا گیا۔ 1947 سے پہلے پاکستان کے مسلم لیڈر یہ کہتے تھے کہ علاحدہ پاکٹ بنانا ہمارے قومی وجود کے لیے ضروری ہے۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو یہ ہوا کہ پاکستان کے اکثر تعلیم یافتہ افراد ''مملکتِ خداداد'' (پاکستان) کو چھوڑ کر امریکا اور یورپ کے ملکوں میں چلے گئے۔ پاکستان میں اُن کو اصرار تھا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں، لیکن دوسرے ملکوں میں جا کر انھوں نے وہاں کی قومیت اختیار کرلی — امریکا میں امریکی قومیت، فرانس میں فرانسیسی قومیت، برطانیہ میں برطانی قومیت، جرمنی میں جرمن قومیت، وغیرہ۔

کشمیر میں جو لوگ کشمیر کو علاحدہ سیاسی پاکٹ بنانے کی کوشش کررہے ہیں، انھیں پاکستان کے اِس عبرت ناک انجام سے سبق لینا چاہیے۔ اُنھیں اِس سے بچنا چاہیے کہ وہ غیر حقیقی نعروں پر اپنی تحریک اٹھائیں اور بعد کو حالات کے دباؤ کے تحت وہ خود اپنے نعروں کے خلاف عمل کرنے لگیں۔

گھیٹو ذہنیت کا نقصان

آج کل کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ تقریباً تمام مسلمان منفی سوچ میں جی رہے ہیں۔ مذہبی مسلمان اور سیکولر مسلمان دونوں یکساں طور پر اِسی قسم کی منفی سوچ رکھتے ہیں، اُن کے مرد بھی اور ان کی عورتیں بھی۔ کسی مسلمان سے بات کیجیے، مسلمانوں کے کسی جلسے میں جائیے، کسی مسلم ادارے کا معائنہ کیجیے، مسلمانوں کا کوئی اخبار یا میگزین پڑھیے، ہر جگہ آپ کو یہی منفی سوچ دکھائی دے گی۔ منفی سوچ ہمیشہ کسی اور

کے خلاف ہوتی ہے، مگر یہ ایک سنگین حقیقت ہے کہ منفی سوچ کا نقصان خود منفی سوچ والوں کو ہوتا ہے، نہ کہ اُن لوگوں کو جن کے خلاف منفی انداز میں سوچا جارہا ہے۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور اِس قانون میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

منفی ذہنیت (negative mentality) کا مطلب ہے، گھیٹو ذہنیت (ghetto mentality)۔ اِس طرزِ فکر کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ دوسروں سے کٹ جاتے ہیں۔ وہ علاحدگی پسندی کے خول میں جینے لگتے ہیں۔ اِس طرح دوسروں کے ساتھ اُن کا انٹریکشن (interaction) ختم ہوجاتا ہے۔ اِس گھیٹو آئڈیالوجی کا بھیانک نتیجہ پس ماندگی اور پچھڑے پن کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

زندگی کا راز علاحدگی پسندی میں نہیں ہے، بلکہ انٹریکشن میں ہے۔ زندگی کا راز لوگوں سے قریب ہونے میں ہے، لوگوں سے دور ہونے میں نہیں ہے۔ زندگی کا راز دوسروں کا خیر خواہ بننے میں ہے، دوسروں سے نفرت کرنے میں نہیں ہے۔ زندگی کا راز مثبت طرزِ فکر میں ہے، منفی طرزِ فکر صرف ہلاکت کا ذریعہ ہے، نہ کہ تعمیر وترقی کا ذریعہ۔

تاریخ کے فیصلے کو بدلنا

کعبہ کو تقریباً چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ میں بنایا تھا۔ اُس وقت کعبہ مستطیل (rectangle) صورت میں تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے قریش مکہ نے کعبہ کی نئی تعمیر کی۔ اُس وقت انھوں نے کعبہ کی لمبائی کو کم کر کے اس کو مربّع (square) صورت میں تعمیر کیا۔ کعبہ اِس مربع صورت میں آج تک موجود ہے۔

روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اہلیہ عائشہ سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ کعبہ کی عمارت کو دوبارہ میں ابراہیمی بنیاد پر بناؤں، مگر آپ اِس سے باز رہے، کیوں کہ عملی اسباب کے تحت اب ایسا کرنا زیادہ بڑی برائی (greater evil) کا سبب بنتا ہے۔ (صحيح البخاري، رقم الحديث: 1583)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس واقعے سے ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ تاریخ کے پہیے کو دوبارہ الٹی طرف نہیں چلایا جاسکتا:

The wheel of history cannot be put in the reverse gear.

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس پیغمبرانہ واقعے سے فطرت کا ایک قانون معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ تاریخ کا سفر ہمیشہ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف ہوتا ہے۔

تاریخ میں یوٹرن (U turn) لینا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ انسان کی طاقت سے باہر ہے کہ وہ تاریخ کے سفر کو مستقبل سے حال کی طرف اور حال سے ماضی کی طرف جاری کردے۔ تاریخ کے معاملے میں موجود صورت حال (statusquo) کو مان کر منصوبہ بنایا جاتا ہے، نہ کہ اس کا انکار کرکے۔

کعبہ کی تاریخ اِس معاملے کی ایک مثال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فطرت کے اِس قانون کو تسلیم کرتے ہوئے سابق ابراہیمی بنیاد پر کعبہ کو دوبارہ تعمیر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بعد کو عبد اللہ بن زبیر (وفات: 692ء) کا زمانہ آیا تو انھوں نے کعبہ کی عمارت کو توڑ کر اس کو دوبارہ ابراہیمی بنیاد پر بنایا، لیکن عبد اللہ بن زبیر کی وفات کے فوراً بعد حجاج بن یوسف الثقفی (وفات: 714ء) نے اس کو توڑ دیا اور دوبارہ کعبہ کو اس کی سابق بنیاد پر تعمیر کردیا۔ موجودہ زمانے کے مسلمان اِس سنتِ رسول سے مکمل طور پر بے خبر ہیں۔ اِس لیے وہ بار بار اِس سنتِ رسول کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ صرف اپنی تباہی میں مزید اضافہ کرلیتے ہیں۔

بیسویں صدی کے ربع اول میں خلافت تحریک، بیسویں صدی کے نصف ثانی میں فلسطینی تحریک، بیسویں صدی کے نصف آخر میں کشمیری تحریک اور اِس قسم کی دوسری تحریکیں اِسی کا ثبوت ہیں۔ اِن تحریکوں کے لیڈروں نے تاریخ کے فیصلے کو بدلنے کی کوشش کی، مگر تاریخ کا فیصلہ نہیں بدلا، البتہ نادانی کی اِس سیاست نے مسلمانوں کی تباہی میں مزید اضافہ کردیا۔ وہ لمحہ جب کہ تاریخ کا فیصلہ ہورہا ہو، اُس وقت آپ اپنی دانش مندانہ پالیسی کے ذریعے فیصلے پر اثر انداز ہوسکتے ہیں، لیکن جب فیصلہ ہوگیا تو اُس کے بعد فیصلے کو بدلنے کی کوشش کرنا عملاً خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ناممکن کی سیاست

موجودہ زمانے کے مسلم رہنما ہر جگہ سیاست کے ہنگامے جاری کئے ہوئے ہیں۔ جہاں بھی کچھ مسلمان ہیں، وہاں اِس کی مثال دیکھی جاسکتی ہے۔ مگر یہ تمام سیاسی ہنگامے مکمل طور پر بے نتیجہ ثابت ہورہے

ہیں۔ اِس کا مشترک سبب یہ ہے کہ یہ تمام مسلم رہنما ناممکن کی سیاست چلا رہے ہیں، یعنی ایک ایسی چیز کے نام پر سیاست جو سرے سے قابلِ حصول ہی نہیں۔ ایسی سیاست کا نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ وہ عملاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائے۔

موجودہ زمانے میں اِس قسم کی سیاست ہر مسلم علاقے میں دیکھی جاسکتی ہے — فلسطین میں یہ نعرہ کہ فلسطین پر اسرائیلی قبضے کو ختم کرو اور وہاں دوبارہ عرب حکومت قائم کرو۔ اِسی طرح کشمیر میں یہ سیاست کہ وہاں سے انڈیا کا غلبہ ختم کیا جائے اور کشمیر کو پاکستان کا حصہ قرار دیا جائے۔ اِسی طرح سنکیانگ (چین) اور فلپائن جیسے مقامات پر یہ مطالبہ کہ یہاں دوبارہ مسلم رول قائم کرو، جیسا کہ وہ پہلے وہاں قائم تھا، وغیرہ۔

اِس قسم کی ہر سیاست ناممکن کی سیاست ہے۔ اِس کا کوئی مثبت نتیجہ ہرگز ملنے والا نہیں۔ اِس قسم کی ناممکن سیاست کا واحد انجام یہ ہے کہ جو کچھ ملا ہوا ہے، وہ بھی چھن جائے اور مزید کچھ حاصل نہ ہو۔ ناممکن کی سیاست عقل کے خلاف بھی ہے اور اسلام کے خلاف بھی۔ سیاست کے معاملے میں عقل اور اسلام دونوں کا تقاضا صرف ایک ہے، وہ یہ کہ اس کو نتیجہ خیز ہونا چاہیے۔ جہاں مثبت نتیجہ ملنے کی امید نہ ہو، وہاں ملے ہوئے پر قناعت کرنا ہے، نہ کہ نہ ملے ہوئے کے لیے لڑائی چھیڑنا۔ ناممکن کی سیاست ہمیشہ صرف لیڈروں کے لیے مفید ہوتی ہے، عوام کے لیے اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

ناممکن کی سیاست لیڈر کے لیے استحصال (exploitation) کی سیاست ہے اور عوام کے لیے صرف نادانی کی سیاست۔ ناممکن کی سیاست کے لیے کم سے کم جو لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے، وہ خودکشی کی سیاست ہے۔ خودکشی سے کم کوئی لفظ اِس تباہ کن سیاست کو بیان کرنے کے لیے کافی نہیں۔ مزید یہ کہ ناممکن کی سیاست صرف ایک فرد کی خودکشی نہیں ہے، بلکہ وہ پوری قوم کی خودکشی ہے۔

آئڈیل اور پریکٹکل

اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کو جب کوئی حقیقت پسندانہ مشورہ دیا جائے تو وہ فوراً ایک آئڈیل بات کہہ دیں گے — مگر انصاف کا تقاضا یہ ہے، حقوقِ انسانی (human rights) کا قانون تو یہ کہتا ہے، انسانی اقدار (human values) کے اعتبار سے تو ایسا ہونا چاہیے، وغیرہ۔ اِس قسم کی باتیں صرف آئڈیل ازم (idealism) کی باتیں ہیں۔ اِس دنیا میں کبھی آئڈیل ازم نہیں چلتا، اِس دنیا میں ہمیشہ وہی

ہوتا ہے جو عملی اعتبار سے قابلِ حصول ہو۔

اِس معاملے میں اصل قابلِ لحاظ بات یہ نہیں ہے کہ ہمارے اپنے معیار کے مطابق، کیا ہونا چاہیے۔ اصل قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ خالق کے تخلیقی منصوبے کے مطابق کیا ہوسکتا ہے۔ یہ مسئلہ کسی نظری معیار کا مسئلہ نہیں ہے، یہ مسئلہ تمام تر یہ ہے کہ اِس دنیا میں کیا چیز عملاً قابلِ حصول ہے اور کیا چیز عملاً قابلِ حصول نہیں۔ خالق کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، اِس دنیا میں ہر انسان کو آزادی حاصل ہے۔ ہم دوسرے کی آزادی کو منسوخ نہیں کر سکتے۔

ہمارے لیے قابلِ عمل بات صرف یہ ہے کہ ہم دوسروں کی رعایت کرتے ہوئے اپنے عمل کا منصوبہ بنائیں، ہم دوسروں کو عمل کا موقع دیتے ہوئے اپنے لیے عمل کا موقع نکالیں۔ یہی زندگی کی حکمت ہے۔ اِس حکمت (wisdom) کی موافقت سے دنیا میں امن قائم ہوتا ہے۔ اِس حکمت کی موافقت نہ کرنا، نفرت اور تشدد کو فروغ دینا ہے، اور نفرت اور تشدد صرف مسئلے میں اضافہ کرنے والا ہے، نہ کہ اس کو ختم کرنے والا۔ یہ فطرت کا ایک اٹل اصول ہے۔ اِس معاملے میں کسی کا کوئی استثنا نہیں۔ جو لوگ فطرت کے اِس نظام کی خلاف ورزی کریں، ان کے لیے اِس دنیا میں صرف تباہی مقدر ہے، خواہ انھوں نے اپنے غیر فطری عمل کو کتنا ہی زیادہ خوب صورت نام دے رکھا ہو۔

پیغمبر کی رہنمائی

حضرت علی بن ابی طالب چوتھے خلیفہ راشد ہیں۔ 40 ہجری (661 عیسوی) میں ان کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد لوگوں نے حضرت حسن بن علی کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرلی۔ مگر اُس وقت مسلمان دو گروہ میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ حضرت حسن کے ساتھ تھا، اور دوسرا گروہ حضرت معاویہ کے ساتھ۔ دونوں گروہوں میں اختلافات اتنے زیادہ بڑھے کہ دونوں گروہوں میں جنگ کی صورت پیدا ہوگئی۔ اُس وقت حضرت حسن کے ساتھ چالیس ہزار مسلح افراد تھے۔ اگر جنگ ہوتی تو دونوں طرف کے ہزاروں آدمی مارے جاتے۔ حضرت حسن نے اِس ٹکراؤ کو پسند نہیں کیا۔ چناں چہ وہ یک طرفہ طور پر عہدے سے دست بردار ہوگئے اور خلافت کا عہدہ حضرت حسن نے معاویہ کے حوالے کردیا۔ حضرت حسن کی یہ روش اُس وقت کے مسلمانوں کو پسند نہیں آئی۔ انھوں نے آپ کے خلاف سخت بیانات دئے۔ ایک مسلمان نے آپ کو خطاب کرتے ہوئے کہا: یا عارَ

المسلمین (اے مسلمانوں کے لیے ننگ وعار)۔ حضرت حسن نے اس کے جواب میں کہا: **العارُ خیرٌ من النار** (ننگ وعار آگ سے بہتر ہے) **البدایۃ والنھایۃ، جلد 8، صفحہ 19-18**۔

حضرت حسن کی اِس مصلحانہ روش کو عام مسلمانوں نے پسند نہیں کیا، کیوں کہ اُن کے نزدیک، یہ ذلت اور پسپائی کی روش تھی۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشگی طور پر اِس روش کی تصدیق فرمائی تھی۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت حسن جب چھوٹے تھے، تو آپ نے اُن کے بارے میں پیشین گوئی کے انداز میں فرمایا تھا: **إن ابني هٰذا سيّد، ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين (صحیح البخاری، رقم الحدیث: 2704)** یعنی یہ میرا بیٹا سردار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہ کے درمیان صلح کرادے۔

اِس واقعے سے زندگی کی ایک اہم حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک روش جو عام مسلمانوں کی نظر میں ذلت اور پسپائی کی روش ہو، وہی روش پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں درست قیادت کی ایک اعلیٰ مثال کی حیثیت رکھتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس طرح کے معاملات میں ذلت اور پسپائی کے الفاظ جاہلیت کے الفاظ ہیں۔ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ اِس طرح کے معاملات کو نتیجہ کی روشنی میں دیکھا جائے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق، نزاعی معاملات میں صرف وہ طریقہ صحیح طریقہ ہے جو ٹکراؤ اور تشدد سے بچانے والا ہو۔ اِس کے برعکس، جو طریقہ ٹکراؤ اور تشدد کی طرف لے جائے، وہ بلاشبہہ جاہلیت کا طریقہ ہے۔ اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ وہ اِس طرح کے معاملے میں ٹکراؤ سے اعراض والا طریقہ اختیار کریں، خواہ ظاہر بیں لوگوں کو وہ ذلت اور پسپائی کا طریقہ دکھائی دیتا ہو۔

اِس واقعے میں اُن تمام مسلمانوں کے لیے بہت بڑی نصیحت ہے، جہاں کشمیر جیسے حالات پیش آرہے ہیں۔ موجودہ زمانے میں بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں کے مسلمان مذکورہ قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہیں۔ ایسے تمام مسلمانوں کے لیے مذکورہ واقعہ ایک رہنما واقعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مسلمان اگر قومی عزت اور قومی وقار کی اصطلاحوں میں سوچتے ہیں تو اُنھیں فوراً اپنی اِس سوچ کو چھوڑ دینا چاہئے، اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں انھیں یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ ہر حال میں امن اور مصالحت کا طریقہ اختیار کریں گے، نہ کہ ٹکراؤ اور تشدد کا طریقہ۔ حضرت حسن کے الفاظ میں، اِس طرح کی صورتِ حال میں تشدد کا

طریقہ اختیار کرنا، جہنم کا طریقہ ہے، اور امن کا طریقہ اختیار کرنا جنت کا طریقہ۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانے میں، حضرت حسن بن علی مسلمانوں کے درمیان غیر مقبول ہو گئے۔ اِس کا سبب کیا تھا۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ وہ لو پروفائل (low-profile) میں بولتے تھے۔ عوام کا یہ عجیب مزاج ہے کہ وہ ایسے افراد کو اپنا قائد بنا لیتے ہیں جو ہائی پروفائل (high-profile) میں بولیں، اور جو شخص لو پروفائل میں بولے، وہ اُن کے درمیان صرف ایک غیر اہم شخص بن کر رہ جاتا ہے۔ مگر عقل اور اسلام دونوں کا یہ فیصلہ ہے کہ خدا کی اِس دنیا میں، ہائی پروفائل میں بولنے والے لوگوں کا انجام تباہی ہو، اور لو پروفائل میں بولنے والوں کا انجام کامیابی۔ اسلام کی صراطِ مستقیم پر صرف وہ لوگ ہیں جو لو پروفائل میں بولنے والے رہنما کا ساتھ دیں۔ اللہ کی نصرتیں صرف ایسے لوگوں کے لیے ہی مقدر ہیں۔

اتباعِ یہودیت

صہیونیت (Zionism) موجودہ زمانے کے یہودیوں کی سب سے بڑی تحریک ہے۔ یہ تحریک 1897 میں شروع ہوئی۔ اس کا مقصد تھا — فلسطین میں دوبارہ یہودی ریاست قائم کرنا:

Zionism: Political and cultural movement seeking to re-establish Jewish national state in Palestine.

دوسرے لفظوں میں یہ کہ صہیونیت، زمین مرکزی سیاست (land-based politics) کا دوسرا نام ہے۔ موجودہ زمانے کے یہودی اپنی تمام طاقت، اپنا تمام سرمایہ، اپنے تمام وسائل اِس سیاست کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے وہ ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔

موجودہ زمانے کے مسلمان، حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق، اِسی یہودی اُسوہ کا اتباع کر رہے ہیں۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی سرگرمی براہِ راست طور پر یا بالواسطہ طور پر اِسی مبنی بر زمین سیاست (land-based politics) کا نمونہ ہے۔ ہر جگہ کے مسلمانوں نے اِسی قسم کی تحریک چلائی کہ وہ زمین کے ایک خطے پر قبضہ کریں اور وہاں اپنی حکومت قائم کریں۔ پاکستان، فلسطین، کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، اراکان، فلپائن، سنکیانگ، وغیرہ۔ ساری دنیا کے مسلمان اِس مبنی بر زمین سیاست میں یا تو عملاً شریک ہیں، یا وہ اِس انداز میں سوچتے ہیں، یا اپنی تقریر اور تحریر میں اِسی کا چرچا کرتے ہیں۔

یہ بلاشبہہ یہودی طریقہ کا اتباع ہے۔ اِس قسم کے قومی اور سیاسی جھگڑے، خواہ وہ اسلام کے نام پر

کئے جائیں، لیکن وہ اسلام نہیں۔ وہ اسلام کے نام پر غیر اسلامی سیاست ہے۔ وہ دین کے نام پر بے دینی کی سرگرمیاں ہیں۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اِس قسم کی قومی اور سیاسی سرگرمی کو مطلق طور پر ترک کردیں، وہ اپنے ملی عمل کی ازسرِ نومنصوبہ بندی کریں۔ اِس قسم کی قومی سیاست کا کوئی مثبت نتیجہ نہ اب تک برآمد ہوا ہے اور نہ آئندہ اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہونے والا ہے۔

اسلام کا جامع تصور

کچھ لوگ اسلام کا جامع تصور پیش کررہے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ — اسلام ایک مکمل نظام ہے۔ اسلام میں صرف عقیدہ اور عبادت اور اخلاق شامل نہیں ہیں، بلکہ پولٹکل سسٹم بھی اس کا لازمی جز ہے۔ پولٹکل سسٹم کو قائم کیے بغیر اسلام ادھورا رہتا ہے، وہ مکمل نہیں ہوتا۔ یہ بظاہر اسلام کا جامع تصور ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف ایک تخریبی تصور ہے۔ موجودہ زمانے کی مسلم ملیٹنسی (Muslim militancy) اِسی نام نہاد جامع تصور کی براہِ راست پیداوار ہے۔

آپ اسلام کے عقیدے کو مانیں، اسلامی طریقے پر عبادت کریں، اسلام کے اخلاقی اصولوں کی پابندی کریں تو یہ آپ کا ایک ذاتی عمل ہوتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے کسی اور کے ساتھ آپ کا ٹکراؤ پیش نہیں آتا، لیکن جب آپ اپنا نشانہ یہ بنائیں کہ مجھے زمین پر اسلامی حکومت قائم کرنا ہے تو یہ نشانہ فوراً آپ کو دوسرے سے ٹکرا دیتا ہے۔ اس لیے کہ پولٹکل اقتدار کوئی خالی سیٹ نہیں ہے جس پر جا کر آپ بیٹھ جائیں۔ پولٹکل اقتدار ہمیشہ کسی کے قبضے میں ہوتا ہے، اِس لیے پولٹکل گدّی کو حاصل کرنے کے لیے فوراً دوسروں سے ٹکراؤ پیش آتا ہے۔ اِس طرح آپ کا سیاسی نشانہ آپ کے اندر یہ ذہن پیدا کرتا ہے کہ آپ اقدام کرکے قابض لوگوں سے اقتدار کی کنجیاں چھین لیں۔ اقتدار کی کنجیوں کو چھیننے کا یہ نظریہ قدرتی طور پر دو گروہوں کے درمیان تشدد اور ٹکراؤ کی صورت پیدا کردیتا ہے۔ موجودہ زمانے میں مختلف مقامات پر جو مسلم ملیٹنسی جاری ہے، وہ براہِ راست طور پر اِسلام کے اِسی نام نہاد جامع تصور کا نتیجہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اصلاً اپنے آپ کو خدا کے احکام کا پابند بنانے کا نام ہے۔ جہاں تک اجتماعی نظام میں اسلام کے سیاسی اور قانونی احکام کے نفاذ کا سوال ہے، وہ تمام تر حالات پر منحصر ہے۔ سماج اگر اِن احکام کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو تو پُرامن کوششوں کے ذریعے اِن احکام کی بجا آوری کی جائے گی،

ورنہ نہیں۔ اسلام کا اصول، تکلیف بقدرِ وسع (2: 286) کا اصول ہے۔

امر موعود، امر مقصود

قرآن کی سورہ النور میں اجتماعی زندگی کے بارے میں ایک حکم بیان ہوا ہے۔ اِس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے اُن لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو زمین میں اقتدار عطا کرے گا، جیسا کہ اُن سے پہلے لوگوں کو اقتدار عطا کیا تھا، اور اُن کے لیے ان کے اُس دین کو جما دے گا جس کو ان کے لیے پسند کیا ہے۔ اور ان کے خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو اس کے بعد انکار کرے، تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں'' (24: 55)۔

قرآن کی اِس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر سیاسی اقتدار کی حیثیت امرِ موعود کی ہے، نہ کہ امرِ مقصود کی۔ مسلمانوں کے لیے اپنے عمل کا نشانہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اندر ایمان اور عملِ صالح کی صفات پیدا کریں، وہ اپنی ساری توجہ اِسی داخلی نشانے پر لگا دیں۔

جہاں تک زمین پر سیاسی غلبہ کا معاملہ ہے، اس کا تعلق تمام تر اللہ تعالی سے ہے۔ قرآن کے مطابق، زمین پر سیاسی غلبہ کا فیصلہ براہِ راست اللہ تعالی کی طرف سے ہوتا ہے، اور وہ اُسی کو ملتا ہے جس کے لیے اللہ نے اس کا فیصلہ کیا ہو (3: 26) — اِس سے معلوم ہوا کہ سیاسی نظام کے قیام کو نشانہ بنا کر عمل کرنا، ایک مبتدعانہ عمل ہے۔ وہ دین کے نام پر بے دینی ہے۔ وہ اسلام کے نام پر اسلام سے انحراف کرنا ہے۔ اِس قسم کی کوشش کو کبھی خدا کی نصرت نہیں ملے گی، اِس لیے ایسی کوشش کبھی کامیاب ہونے والی نہیں۔

یک طرفہ رپورٹنگ

قرآن کی سورہ التطفیف میں، ناپ تول میں کمی کو ایک مجرمانہ فعل بتایا گیا ہے۔ یہاں متعلق آیات کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے: خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ جو لوگوں سے ناپ کر لیں تو وہ پورا لیں۔ اور جب وہ اُن کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں:

> Woe to those who give short measure, who demand of other people full measure for themselves, but when they give by measurment or weight to others, they give them less.(83:1–3)

قرآن کی اِس آیت میں جس اخلاقی برائی کا ذکر ہے، اُس سے مراد محدود طور پر صرف ناپ تول کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق زندگی کے تمام اجتماعی معاملات سے ہے۔ موجودہ زمانے میں اِس تطفیف کی ایک تباہ کُن صورت وہ ہے جس کو یک طرفہ رپورٹنگ کہا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ برائی مسلمانوں کے اندر بہت زیادہ عام ہے۔ مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے یہ کرتے ہیں کہ جب بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی ٹکراؤ ہوتو وہ صرف غیر مسلموں کی طرف سے کی جانے والی کارروائی کو بیان کرتے ہیں، اور مسلمانوں نے اپنی طرف سے جو کچھ کیا تھا، اُس کو وہ حذف کر دیتے ہیں۔ وہ غیر مسلموں کی جوابی کارروائی کو بیان کرتے ہیں، وہ مسلمانوں کی طرف سے کئے جانے والے اقدام کو بیان نہیں کرتے۔

اِس طرح کے معاملات میں کہنے والے اکثر یہ کہتے ہیں کہ کوئی آپ کے گھر میں گھس آئے تو آپ کیا کریں گے۔ اِسی کا نام یک طرفہ رپورٹنگ ہے، کیوں کہ کوئی گھسنے والا اچانک نہیں گھستا، بلکہ پہلے گھر والے اپنی کسی کارروائی سے اس کو مشتعل کرتے ہیں، اس کے بعد کوئی گھسنے والا اُن کے گھر میں گھستا ہے۔ اِس کا حل اپنے حصے کی اشتعال انگیزی کو روکنا ہے، نہ کہ گھسنے والے کے خلاف بے فائدہ چیخ و پکار کرنا۔ اِسی طرح کی صورتِ حال کے بارے میں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: **الفتنة نائمة، لعن الله من أيقظها (الجامع الصغير للسيوطی، رقم الحديث:** 5975) یعنی فتنہ سویا ہوا ہے۔ اللہ اُس شخص پر لعنت کرے جو اِس سوئے ہوئے فتنے کو جگائے۔

اِس یک طرفہ رپورٹنگ (one-sided reporting) کا یہ بھیانک انجام ہوا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ صرف مظلوم ہیں، اور دوسرے لوگ صرف ظالم۔ اِس ناقص رپورٹنگ کا مزید نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان منفی سوچ (negative thinking) میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ وہ دوسری قوموں کو دشمن سمجھ کر اُن سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ انسانوں کے بارے میں وہ نفرت کی نفسیات میں جیتے ہیں، نہ کہ محبت کی نفسیات میں۔

اِس یک طرفہ رپورٹنگ کی برائی صرف یہ نہیں ہے کہ وہ حقیقت کے اعتبار سے، خلافِ واقعہ ہے۔ اِس کا شدید تر نقصان یہ ہے کہ اُس نے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو منافقت میں مبتلا کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ دوسری قوموں سے الگ ہو کر اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ اپنے مادّی مفاد

کے تحت اُن کو بار بار دوسری قوموں سے مصالحانہ تعلق قائم کرنا پڑتا ہے۔ چناں چہ اُن کا حال یہ ہے کہ وہ نفرت کی اِس سوچ کو باقی رکھتے ہوئے دوسری قوموں سے سماجی اور اقتصادی تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ دل میں نفرت رکھتے ہوئے وہ لوگوں کے ساتھ دوستانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ یہ بلاشبہہ دوعملی ہے، اور دوعملی ہی کا دوسرا نام منافقت ہے۔

یک طرفہ رپورٹنگ، یعنی کسی واقعے کے ایک پہلو کو بیان کرنا اور دوسرے پہلو کو بیان نہ کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ اِس کے بے شمار نقصانات ہیں — اِس طرح کی رپورٹنگ سے آدمی کے اندر غیر سنجیدگی پیدا ہوتی ہے۔ سچ اور جھوٹ میں فرق کرنے کی صلاحیت اس کے اندر سے ختم ہوجاتی ہے۔ وہ قومی عصبیت میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ معاملات میں حقیقت پسندانہ مزاج اس کے اندر باقی نہیں رہتا۔ دوسروں کے لیے خیر خواہی کا جذبہ اس کے اندر سے ختم ہوجاتا ہے۔ وہ منفی سوچ میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ اس کے اندر پہلے شکایتی مزاج پیدا ہوتا ہے، اس کے بعد وہ لوگوں سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ آخر میں وہ متشددانہ کارروائی کو اپنے لیے جائز سمجھ لیتا ہے — شراب اگر جسمانی اعتبار سے، اُمّ الخبائث ہے، تو یک طرفہ رپورٹنگ سوچ کے اعتبار سے، ام الخبائث کی حیثیت رکھتی ہے۔

عمومی فتنہ

قرآن کی سورہ الانفال میں ارشاد ہوا ہے: **واتقوا فتنةً لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصّةً** ۔ یعنی ڈرو اُس فتنے سے جو خاص اُنھیں لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں سے غلط کاری کے مرتکب ہوئے ہیں:

Beware of an affliction that will not smite exclusively those among you who have done wrong.(8: 25)

قرآن کی اِس آیت میں ’فتنہ‘ سے مراد خدائی فتنہ نہیں ہے، بلکہ انسانی فتنہ ہے، یعنی اشتعال کی وہ صورتِ حال جو ایک انسان یا بعض انسانوں کے ناعاقبت اندیشانہ عمل کے ذریعے پیدا ہوئی ہو۔ اِس طرح کی صورتِ حال جب کسی سماج میں پیدا ہوجائے تو اُس کے بعد وہاں جو شورش برپا ہوگی، اس کا برا انجام انتخابی طور پر پیش نہیں آئے گا، بلکہ اس کا برا انجام عمومی طور پر پورے سماج کو بھگتنا پڑے گا۔

مثال کے طور پر ایک شہر میں غیر مسلموں کی ایک عبادت گاہ ہے۔ وہاں لاؤڈ اسپیکر پر اُن کا کوئی پروگرام ہورہا ہے۔ اب اگر کچھ مسلمانوں کو اِس پر شکایت پیدا ہو، وہ غیر مسلم عبادت گاہ میں جا کر اُن سے

لاؤڈ اسپیکر بند کرنے کے لیے کہیں، مگر وہ لوگ اس کو بند نہ کریں۔ اِس پر مسلمان غصہ ہوجائیں اور وہ اُن کے لاؤڈ اسپیکر کو توڑ کر پھینک دیں، تو یہ معاملہ کسی حد پر نہیں رکے گا، بلکہ جب یہ خبر پھیلے گی تو غیر مسلموں کی پوری کمیونٹی شدید ردعمل کا شکار ہو جائے گی۔ وہ مسلم کمیونٹی کے خلاف جذباتی کارروائی کرے گی۔ اِس کارروائی کا نشانہ صرف وہی مسلمان نہیں بنیں گے جنھوں نے لاؤڈ اسپیکر کو توڑا تھا، بلکہ اس مقام کی پوری مسلم کمیونٹی اس کی زد میں آجائے گی۔

اِسی طرح مثلاً غیر مسلموں کا ایک جلوس نکلتا ہے۔ وہ ایسی سڑک سے گزرنا چاہتا ہے جہاں مسلمانوں کی مسجد واقع ہے۔ اب کچھ مسلمان سامنے آجاتے ہیں۔ وہ جلوس والوں سے یہ مانگ کرتے ہیں کہ تم لوگ اپنے جلوس کا راستہ بدلو۔ اِس سے ہماری مسجد کی بے حرمتی ہوگی۔ اب مسلمان، پولس سے یہ مانگ کرتے ہیں کہ وہ مداخلت کرے اور جلوس کی روٹ (route) کو بدلوائے۔ مگر پولس، مسلمانوں کی مانگ کے مطابق جلوس کی روٹ کو نہیں بدلواتی۔ اب مسلمان مزید غصہ ہوجاتے ہیں۔ وہ پولس پر پتھر مارتے ہیں۔ اس کے بعد پولس مشتعل ہوجاتی ہے۔ وہ مسلمانوں کی بھیڑ کو منتشر کرنے کے لیے ان پر گولی چلاتی ہے۔ پولس کی اس گولی کا شکار وہ مسلمان ہوتے ہیں جنھوں نے پولس کو پتھر مارا، اور وہ بھی جنھوں نے پولس کو پتھر نہیں مارا۔

یہی معاملہ اُن مقامات کا ہے جہاں زیادہ بڑے پیمانے پر یہ صورتِ حال پیش آرہی ہے۔ مثلاً کشمیر اور فلسطین، وغیرہ۔ اِن مقامات پر بھی یہی ہوتا ہے کہ پہلے مسلمان، پولس یا فوج پر پتھر مارتے ہیں۔ اس کے بعد پولس یا فوج مسلمانوں کے اوپر گولی چلاتی ہے یا ہوائی جہاز سے وہ ان کے اوپر بم گراتی ہے۔ اِس طرح کے واقعات میں عملاً یہی ہوتا ہے کہ جو مسلمان براہِ راست طور پر اِس فعل میں ملوث نہیں ہوتے، وہ بھی جوابی کارروائی میں فوج کی گولی اور بم کا نشانہ بنتے ہیں، یعنی ملوث ہونے والے مسلمان بھی اور ملوث نہ ہونے والے مسلمان بھی۔

اِس طرح کے تمام واقعات پر قرآن کی مذکورہ آیت چسپاں ہوتی ہے۔ ایسے واقعات کو لے کر یہ احتجاج کرنا کہ فریقِ ثانی کی جوابی کارروائی میں قصور وار مسلمان اور غیر قصور وار مسلمان دونوں زد میں آئے، اور یہ انسانی حقوق کے خلاف ہے۔ اِس طرح کا احتجاج سرتا سر باطل ہے۔ قرآن ایسے کسی احتجاج کی تصدیق نہیں کرتا۔ اِس طرح کے واقعات میں ایسا ہونا بالکل فطری ہے کہ قصور وار کے ساتھ غیر قصور وار بھی

مارے جائیں۔

قرآنی اصول کے مطابق، اِس طرح کے معاملے میں وہ لوگ ذمے دار قرار پاتے ہیں جنھوں نے ابتدائی طور پر اشتعال انگیزی کی کارروائی کی (9: 13)۔ اِس آیت کے مطابق، مسلم رہنماؤں کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ مسلم معاشرے میں اشتعال کا ماحول پیدا نہ ہونے دیں، نہ یہ کہ اشتعال کے بعد کے واقعات کو لے کر وہ شکایت اور احتجاج کا ہنگامہ برپا کریں۔ ایسی روش کا دہرا نقصان ہے۔ ایک یہ کہ ایسے لوگ خدا کے غضب کا شکار ہوں، مزید یہ کہ صورتِ حال کی کبھی اصلاح نہ ہو، اور وہ ہمیشہ ''ذلت اور مسکنت'' کے اِسی حال میں مبتلا رہیں۔

ردِّ عمل اسلام میں نہیں

بہت سے لوگ جنگ اور تشدد میں مبتلا ہیں، انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی۔ اُن سے کہا جائے کہ تم یہ تباہ کُن کام کیوں کر رہے ہو، تو وہ یہ جواب دیں گے کہ — یہ تو ایک فطری ردّ عمل ہے۔ جب کسی گروہ کے خلاف ظلم اور نا انصافی کا واقعہ پیش آئے گا، تو اس کے اندر ضرور جوابی ردّ عمل (reaction) پیدا ہوگا۔ وہ گن اور بم استعمال کرے گا، یہاں تک کہ آخر کار وہ خود کُش بم باری (suicide bombing) کا طریقہ اختیار کرے گا۔ اگر ہمارے متشددانہ ردّ عمل کو ختم کرنا ہے، تو فریقِ ثانی کی طرف سے کیے جانے والے ظلم اور نا انصافی کو ختم کرنا ہوگا، ورنہ ہماری طرف سے متشددانہ کارروائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ ردّ عمل (reaction) کو ختم کرنا ہے تو پہلے عمل (action) کو ختم کیجیے۔ اِس معاملے میں یک طرفہ نصیحت سے کوئی فائدہ ہونے والا نہیں۔

ردّ عمل کا یہ فلسفہ سرتا سر غیر فطری ہے۔ ایسے لوگوں کی اصل غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ذہنوں میں عمل کا غلط معیار قائم کرلیا ہے۔ عمل کا صحیح معیار یہ ہے کہ عمل کے بعد پیش آنے والے نتیجہ (result) کو دیکھا جائے۔ صحیح عمل کی پہچان یہ ہے کہ وہ عمل کرنے والوں کے لیے مفید نتیجہ پیدا کرے۔ جو عمل مفید نتیجہ پیدا نہ کرے، وہ سرے سے قابلِ ترک ہے۔

یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ کوئی عمل یا تو مفید نتیجہ پیدا کرتا ہے، یا وہ عمل کرنے والوں کے لیے کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہوتا ہے۔ اِس معاملے میں تیسری کوئی صورت

نہیں۔عملی اقدام وہی درست ہے جونتیجہ خیز ہو۔ جوعملی اقدام نتیجہ خیز نہ ہو، وہ صرف اپنی تباہی میں اضافے کے ہم معنیٰ ہے، اور اپنی تباہی میں اضافہ کبھی کسی دانش مند کا کام نہیں ہوسکتا۔کسی عمل کے مقابلے میں جذباتی ردّعمل، اُس عمل کا جواب نہیں۔عمل کا حقیقی جواب یہ ہے کہ پہلے صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے، مثبت ذہن کے ساتھ نتیجہ خیز منصوبہ بندی کی جائے، پھر ٹکراؤ کے بجائے تعمیر کے اصول پر اپنے عمل کا آغاز کیا جائے۔یہی صحیح اسلامی طریقہ ہے۔

دوسرا شجرِ ممنوعہ

آدم پہلے انسان تھے۔ پیدائش کے بعد اُن کو جنت میں رکھا گیا۔وہاں اُن کو ہر قسم کی آزادی حاصل تھی۔لیکن جنت میں ایک شجرِ ممنوعہ (forbidden tree) تھا۔آدم سے کہا گیا کہ جنت میں تم آزادانہ طور پر رہ سکتے ہو،لیکن اِس شجرِ ممنوعہ کے قریب مت جانا، ورنہ تم کو جنت سے نکال دیا جائے گا۔ اِسی طرح موجودہ دنیا میں بھی ایک شجرِ ممنوعہ ہے،اور وہ تشدد ہے:

> There was a forbidden tree in Paradise. There is also a forbidden tree in this world, and that is violence.

جولوگ تشدد میں ملوث ہوں، اُن کو اپنے اِس جرم کی یہ بھاری قیمت دینی پڑے گی کہ وہ جنت میں داخلے سے محروم کردئے جائیں۔قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم اور اُن کی بیوی حوا جب کرۂ ارض پر بسائے گئے تو یہاں آغاز ہی میں ایک حادثہ پیش آیا۔آدم کے دو بیٹوں، قابیل اور ہابیل کے درمیان نزاع ہوئی، یہاں تک کہ قابیل نے ہابیل کو مارڈالا۔قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اِس واقعے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ لکھ دیا کہ:''جو شخص کسی کو قتل کرے، بغیر اِس کے کہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اُس نے سارے آدمیوں کو قتل کرڈالا'' (5: 32)۔

قرآن میں اِس قسم کے سخت الفاظ کسی بھی دوسرے جرم کے لیے نہیں آئے ہیں۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ سنگین جرم یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے خلاف جارحانہ تشدد کرے۔ اِس معاملے میں اگر کوئی استثنا ہے تو وہ ایک منظم حکومت یا ایک باقاعدہ عدالت کے لیے ہے۔عام انسان کے لیے اِس معاملے میں کوئی استثنا نہیں۔تشدد کی یہ سخت ممانعت اِس لیے ہے کہ تشدد فطری نظام کے خلاف ہے۔خالق کا قائم کردہ فطری نظام یہ ہے کہ ہر عورت اور ہر مرد کو آزادانہ طور پر کام

کرنے کا موقع ملے، لیکن تشدد اور جارحیت سے یہ فطری نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ تشدد خالق کے فطری نظام میں مداخلت ہے۔ اور اِس قسم کی مداخلت بلاشبہہ سب سے زیادہ سنگین جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔

موجودہ دنیا میں تشدد اور جارحیت سے پاک ماحول کس طرح بنایا جائے، اِس کا جواب صرف ایک ہے— اللہ سے ڈرنے والوں کو اپنے اوپر یہ ذمے داری لینا ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر صبر کریں، وہ تشدد کے تجربے کے باوجود عملاً بے تشدد بن جائیں۔ صرف اِسی طرح تشدد سے پاک ماحول دنیا میں بن سکتا ہے۔ قرآن کی سورہ المائدہ میں بتایا گیا ہے کہ جب قابیل نے ہابیل کو مارنا چاہا تو ہابیل نے کہا: **لئن بسطتَ إليَّ يدک لتقتلني، ما أنا بباسط يديَ إليک لأقتلک،إنّي أخاف الله ربَّ العالمين** (5: 28) یعنی اگر تم مجھے قتل کرنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھاؤ گے تو میں تم کو قتل کرنے کے لیے تم پر اپنا ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے، جو سارے جہان کا رب ہے۔

تشدد پر یک طرفہ صبر کی یہ آخری مثال ہے جو آدم کے بیٹے ہابیل نے قائم کی۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بعد کے زمانے میں سیاسی بگاڑ پیدا ہوگا، مگر تم اپنے حکم رانوں سے ہرگز ٹکراؤ نہ کرنا۔ ایک صحابی نے پوچھا کہ اگر وہ خود ہمارے گھر میں ہم کو مارنے کے لیے آجائیں تو ہم کیا کریں۔ آپ نے جواب دیا: **فليكن كخير ابنَي آدم** (سنن أبي داؤد، رقم الحديث: 4259) یعنی تم آدم کے دو بیٹوں میں سے اچھے بیٹے بن جاؤ، یعنی خواہ تم دوسروں کے ہاتھ سے قتل ہو جاؤ، مگر تم خود دوسروں کو قتل کرنے کی کوشش نہ کرو۔

تشدد کی دو قسمیں ہیں— ایک، غیر فعّال تشدد (passive violence)۔ اور دوسرا، فعّال تشدد (active violence)۔ غیر فعّال تشدد یہ ہے کہ آپ دوسروں کو ظالم بتا کر ان سے نفرت کریں۔ اور فعال تشدد یہ ہے کہ آپ دوسروں کو ظالم بتا کر اُن کے خلاف جارحانہ کارروائی شروع کر دیں۔ یہ دونوں صورتیں اسلام میں یکساں طور پر گناہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ دونوں میں سے جس تشدد کا ارتکاب کریں، آپ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے کے مرتکب قرار پائیں گے۔ دونوں قسم کے تشدد کے درمیان صرف ظاہر کا فرق ہے، حقیقت کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

ماضی کو بھلانا

قرآن میں عفو و درگزر کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے (42: 43)۔ عفو و درگزر کا مطلب ہے،

گزرے ہوئے دنوں کو بھلا دینا۔ جو کچھ ماضی میں ہوا، اس کو حال میں یاد رکھنا کوئی سادہ بات نہیں۔ اس کا مطلب ہے— گزری ہوئی مصیبت کو تلخ یاد کی صورت میں بدستور زندہ رکھنا۔ یہ طریقہ اسلام کے خلاف بھی ہے اور عقل کے خلاف بھی۔ اسی بات کو برنارڈ شا (Bernard Shaw) نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا— سب سے زیادہ غیر تعلیم یافتہ انسان وہ ہے جس کے پاس بھلانے کے لیے کچھ نہ ہو:

The most uneducated man is one who has nothing to forget.

موجودہ زمانے میں جن مقامات پر مسلمان، تشدد کی کارروائیوں میں مشغول ہیں، وہ مسلسل قربانیوں کے باوجود اپنے مطلوب نتیجے کو حاصل نہ کرسکے۔ اِس کے باوجود وہ اپنے لاحاصل تشدد کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ اِس کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ ہے ماضی کے تلخ واقعات کو نہ بھلانا۔ اِن مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ماضی کے تلخ واقعات کا چرچا کرتے رہتے ہیں۔ وہ اِسی کے بارے میں لکھتے ہیں اور اِسی کے بارے میں بولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزرے ہوئے واقعات مسلسل طور پر ان کو مشتعل کئے رہتے ہیں۔

یہ طریقہ اسلام اور عقلِ انسانی دونوں کے خلاف ہے۔ اِن علاقوں کے مسلمانوں کے لیے فرض کے درجے میں ضروری ہے کہ وہ گزرے ہوئے منفی واقعات کو مکمل طور پر بھلا دیں، وہ اُن کو اللہ کے خانے میں ڈال دیں۔ اِس طرح وہ اِس قابل ہوجائیں گے کہ وہ اپنے معاملات پر حقیقت پسندانہ انداز میں سوچیں اور نتیجہ خیز طور پر اپنے عمل کی زیادہ درست منصوبہ بندی کرسکیں۔

نقصان برائے آزمائش

قرآن کی سورہ البقرہ میں، انسانوں کے بارے میں اللہ کی ایک سنت کو بتایا گیا ہے۔ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے: ''اور ہم ضرور تم کو آزمائیں گے، کچھ ڈر اور بھوک سے، اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو، جن کا حال یہ ہے کہ جب اُن کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ— ہم اللہ کے ہیں اور ہم اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے اوپر اُن کے رب کی عنایتیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ ہیں جو صحیح راہ پر ہیں''۔ (2:155—157)

موجودہ دنیا کا نظام اِس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں لوگوں کو طرح طرح کے نقصانات کا تجربہ ہوتا ہے۔

یہ نقصانات بظاہر کسی انسان کی طرف سے پیش آتے ہیں، اِس لیے عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اُسی انسان کو نقصان کا ذمے دار سمجھ کر اس کے خلاف نفرت میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ یہ نفرت بڑھتے بڑھتے تشدد تک پہنچ جاتی ہے۔مگر یہ سوچ سنتِ الٰہی کے خلاف ہے۔ اِسی لیے نفرت اور تشدد کا کوئی مثبت انجام ایسے لوگوں کو نہیں ملتا۔

صحیح یہ ہے کہ جب کوئی نقصان پیش آئے تو اس کا الزام دوسروں کو نہ دیا جائے، بلکہ خود اپنا محاسبہ (introspection) کیا جائے۔ دنیا کے اِن نقصانات کے حوالے سے آخرت کو یاد کیا جائے۔ اِن نقصانات کو خدائی یاد دہانی (divine warning) سمجھا جائے اور اپنی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ اِس طرح کے نقصانات کو اگر خدا کے قائم کردہ نظامِ فطرت کے خانے میں ڈالا جائے تو اُس سے لوگوں کے اندر مثبت ذہن بنے گا۔ ایسا کرنے سے لوگ کھوئے ہوئے کے غم کو لے کر مایوسی کا شکار ہونے سے بچ جائیں گے اور اُس سے سبق لے کر ازسرِ نو اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کریں گے۔

جس طرح ہر پیدا ہونے والے پر موت آتی ہے، اور زندہ رہنے والوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اِس موت کو بھلا دیں، اُسی طرح، ہر پائی ہوئی چیز کو کبھی نہ کبھی کھونا پڑتا ہے۔ اِس معاملے میں آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کھوئی ہوئی چیز کو اُسی طرح بھلا دے، جس طرح وہ مرنے والے کو بھلا دیتا ہے۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایک چیز کھوئی جاتی ہے تو فطرت کے نظام کے تحت، دوسری ہزاروں چیزیں موجود رہتی ہیں جو اب بھی انسان کو حاصل ہیں۔ ایسی حالت میں، کھوئے ہوئے کو نہ بھلانے کی یہ بھاری قیمت دینی پڑتی ہے کہ آدمی کے اندر سے شکر کا جذبہ رخصت ہوجاتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ کھوئی ہوئی چیز کے غم میں ملی ہوئی چیزوں کا شکر ادا کرنے سے محروم ہورہا ہے۔ یہ گویا دنیا کے حقیر نقصان پر آخرت کے عظیم نقصان کا خطرہ مول لینا ہے۔ یہ عارضی محرومی کی خاطر اپنے آپ کو ابدی محرومی کا مستحق بنانا ہے، اور بلاشبہہ کوئی مومن اِس تباہ کن روش کا تحمل نہیں کرسکتا۔

کوئی نقصان، نقصان نہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنے مشن کا آغاز کیا۔ 13 سال کے بعد آپ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ چلے گئے۔ ہجرت کے تیسرے سال غزوۂ احد پیش آیا۔ یہ غزوہ مدینے سے باہر جبل احد کے پاس ہوا تھا۔ اِس غزوہ میں 70 صحابہ شہید ہوگئے۔

غزوہ احد کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ بنو دینار کی ایک مسلم خاتون السُّمیر ابنت قیس کے گھر کے تین افراد اِس غزوہ میں مارے گئے تھے — ان کے باپ، ان کے شوہر، ان کے بھائی۔ جب اس خاتون کو خبر دی گئی کہ تمھارے گھر کے تین افراد اِس جنگ میں شہید ہوگئے تو اس نے پوچھا: **فما فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا ہوا)۔ اس کو بتایا گیا کہ آپ محفوظ اور سلامت ہیں۔ اس کے بعد وہ چل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی۔ جب اس نے آپ کو دیکھا تو اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: **کلُّ مصیبة بعدک جَلَلٌ** (آپ کے بعد ہر مصیبت ہیچ ہے، اے خدا کے رسول (**السیرۃ النبویۃ لابن ہشام**، جلد 3، صفحہ 51)

یہ صرف ایک صحابی خاتون کا ایک قول نہیں۔ یہ ایک صحابیہ کے اسوہ کی روشنی میں، امتِ محمدی کے ہر فرد کے لیے قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ ایک صاحبِ ایمان کو، ایمان کے بعد اتنی بڑی دولت مل جاتی ہے کہ اس کے بعد ہر نقصان اس کو ہیچ نظر آنے لگتا ہے۔

جب ایک شخص کو سچائی کی دریافت ہوتی ہے اور وہ ایک مومن انسان بن جاتا ہے تو یہ اس کے لیے کوئی سادہ معاملہ نہیں ہوتا۔ اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس کو حقیقتِ اعلیٰ کی معرفت حاصل ہوگئی۔ اس نے اللہ رب العالمین کو پالیا۔ اس کو خاتم النبیین کی دریافت ہوگئی۔ اس کو قرآن کی شکل میں، اپنی زندگی کا ربانی ہدایت نامہ مل گیا۔ وہ فرشتوں کی صحبت کا مستحق بن گیا۔ اُس نے اُس صراطِ مستقیم کو جان لیا جس کو اختیار کرکے آدمی خدا کی رحمتوں کے سائے میں آجائے اور آخر کار وہ ابدی جنت میں پہنچ جائے۔

اِس قسم کے آدمی کے لیے کوئی نقصان نقصان نہیں، کیوں کہ ہر نقصان کے باوجود اُس کو اتنا بڑا خزانہ ملا ہوا ہوتا ہے جو ہر نقصان کو اس کے لیے بے حقیقت بنا دیتا ہے۔ ایک سچا صاحبِ ایمان ہمیشہ یافت (finding) میں جیتا ہے۔ اِس احساس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ محرومی یا مایوسی کا لفظ سچے اہل ایمان کی ڈکشنری سے اِس طرح گم ہوجاتا ہے، گویا کہ وہ موجود ہی نہیں۔ اِسی حقیقت کی بنا پر اسلام میں مایوسی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ مایوسی کو حرام قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ جب اِس دنیا میں مایوسی کے اسباب نہیں تو کسی شخص کو یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ مایوسی کے احساس میں زندگی گزارے۔

خدا میں جینا

موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا کیس ایک لفظ میں یہ ہے کہ وہ خدا میں جینے والے نہیں بنے، وہ غیر خدا میں جی رہے ہیں۔ یہی واحد سبب ہے جس نے تمام مسلمانوں کو منفی سوچ میں مبتلا کر دیا ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں منفی سوچ اتنی زیادہ عام ہے کہ مشکل ہی سے اس میں کسی عورت یا مرد کا استثنا نظر آئے گا۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا لکھنا اور بولنا، سب کا سب ان کی منفی سوچ کا اظہار ہے۔

منفی سوچ کا سبب کیا ہے۔ منفی سوچ دراصل شکایت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ہر مسلمان کسی نہ کسی کے خلاف شکایت کا جذبہ لئے ہوئے ہے کہ فلاں نے زمین پر قبضہ کرلیا، فلاں نے اپنی فوجیں مسلم ملک میں اتار دیں، فلاں نے اسلام کی بے حرمتی کردی، فلاں نے ہم کو انصاف نہیں دیا، فلاں ہمارے ساتھ امتیازی سلوک کرتا ہے، وغیرہ۔ آج کل ہر مسلمان اِس قسم کی شکایتوں میں جیتا ہے۔ اِنھیں شکایتوں نے ہر مسلمان کو منفی سوچ میں مبتلا کر دیا ہے۔ مگر منفی سوچ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ منفی سوچ کا مطلب دراصل یہ ہے کہ انسان نے کسی اور چیز کو وہ اہمیت دے دی جو اہمیت اُسے خدا کو دینا چاہیے:

Making one’s concern something else other than God.

خدا کو پانا سب سے بڑی چیز کو پانا ہے۔ جس آدمی کو خدا کی دریافت ہوجائے، اس کی سوچ اتنی زیادہ بلند ہوجاتی ہے کہ ہر دوسری چیز اس کی نظر میں حقیر بن جاتی ہے۔ کسی چیز کا کھونا یا پانا دونوں اس کی نظر میں یکساں ہوجاتے ہیں۔ وہ اِس نفسیات میں جینے لگتا ہے کہ — تم جو چیز چاہو، مجھ سے چھین لو، لیکن تم خدا کو مجھ سے نہیں چھین سکتے:

You can take away from me whatever you want, but you cannot take God away from me!

یہ نفسیات ایک مومن کو انتہائی حد تک مثبت سوچ والا انسان بنا دیتی ہے۔ کسی کے خلاف نفرت یا مایوسی کا ایک ذرہ بھی اس کے اندر باقی نہیں رہتا۔

وقت ضائع نہ کیجئے

انسان دنیا میں کس لیے آیا ہے — وہ اِس لیے نہیں آیا ہے کہ یہاں وہ اپنی پسند کی حکومت قائم کرے۔ وہ یہاں صرف اِس لیے آیا ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو خالق کی پسند کے مطابق بنائے۔ انسان کو موجودہ

دنیا میں صرف چند سال کی عمر ملی ہے۔ چند سال کی اِس مدت میں کوئی دوسرا کام کرنا، اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے ضائع کرلینا ہے۔ صحیح استعمال صرف وہ ہے جو موت کے بعد کام آئے۔ موت کے بعد صرف وہ انسان کامیاب قرار دیا جائے گا جس نے موت سے پہلے کی زندگی میں اپنے آپ کو خالق کی پسند کے مطابق بنایا ہو۔

خالق کی پسند کیا ہے، کشمیر جیسا علاقہ اس کا ایک زندہ نمونہ ہے۔ کشمیر کی وادیوں میں جاری چشمے خالق کی پسند کا اعلان کررہے ہیں۔ یہاں کے ہرے بھرے درخت اپنی خاموش زبان میں خالق کی پسند کو بتا رہے ہیں، یہاں کی فضاؤں میں اڑتے ہوئے پرندے خالق کی پسند کا چرچا کررہے ہیں، یہاں کے خوب صورت پہاڑوں میں خالق کی پسند کا نغمہ گونج رہا ہے۔ یہاں کی مسحور کُن فضاؤں میں ہر طرف خالق کی پسند کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ کشمیر گویا فطرت کی زبان میں خالق کا کلام ہے۔ کشمیر کے ماحول میں انسان خالق کے پڑوس کا تجربہ کرتا ہے۔

کشمیر کی سرزمین میں پیدا ہونے والے ہر انسان کا پہلا فرض ہے کہ وہ خالق کی اِس زندہ کتاب کو پڑھے اور اس کے مطابق، اپنی زندگی کی تشکیل کرے۔ جو لوگ یہ کام نہ کریں، اُن کے لیے موت کے بعد صرف یہ انجام سامنے آئے گا کہ وہ ابد تک حسرت میں جیتے رہیں۔ اُن کے حصے میں صرف یہ مایوسانہ سوچ آئے کہ اُن کا کیس صرف مواقع کے استعمال سے محرومی کا کیس تھا:

Mine was a case of missed opportunities.

دنیا میں کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ آدمی یہاں اپنی شخصیت کو جنتی شخصیت بنائے، تاکہ آخرت میں اس کو اللہ کی ابدی جنت میں داخلہ ملے۔ موجودہ دنیا جنت کی تعمیر کی جگہ نہیں ہے، بلکہ وہ جنتی شخصیت کی تعمیر کی جگہ ہے۔ اِس دنیا میں جنتی شخصیت کی تعمیر ہی وہ کام ہے جس کے لیے انسان کو عمل کرنا چاہیے: **لمثل هذا، فليعمل العاملون** (37: 61)

پتھر سے قرآن تک

ایک کشمیری مسلمان نے کہا کہ — اکتوبر 1989 سے اکتوبر 2011 تک ہم نے ایک لمبا راستہ طے کیا ہے۔ پہلے ہم آرمی کے اوپر پتھر مارتے تھے، اب ہم آرمی کے سامنے قرآن پیش کرتے ہیں۔ ایک کشمیری مسلمان کے یہ الفاظ کشمیر میں آنے والے نئے دورِ انقلاب کو بتا رہے ہیں، وہ کشمیر میں ایک نئے

آغاز کی علامت ہیں۔ ایک بار جب تاریخ میں ایک صحت مند عمل (healthy process) شروع ہوجائے تو وہ جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی منزل تک پہنچ جائے۔

مذکورہ کشمیری مسلمان کے الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ — کشمیری مسلمان پہلے بے شعوری میں جی رہے تھے، اب انھوں نے شعور میں جینا سیکھ لیا ہے۔ کشمیری مسلمان پہلے نفرت میں جی رہے تھے، اب انھوں نے محبت میں جینا شروع کر دیا ہے۔ کشمیری مسلمان پہلے انسان کو اپنا حریف سمجھتے تھے، اب انھوں نے انسان کو اپنا مدعو سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ کشمیری مسلمان پہلے تشدد میں جی رہے تھے، اب انھوں نے امن میں جینے کا راز دریافت کرلیا ہے۔ کشمیری مسلمان پہلے شیطان کے کلچر کو اختیار کئے ہوئے تھے، اب انھوں نے فرشتوں کے کلچر پر چلنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ شیطان کا کلچر کیا ہے، اللہ نے آدم (انسان) کو پیدا کیا اور ابلیس سے کہا کہ انسان کا اعتراف کرو۔ ابلیس نے ایک خود ساختہ عذر لے کر انسان کا اعتراف کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے برعکس، فرشتوں نے اللہ کے حکم کے مطابق، فوراً آدم کا اعتراف کرلیا۔ گویا شیطان نے آدم کی طرف پتھر پھینکے اور فرشتوں نے اِس معاملے میں اپنے لیے خدا کے کلام کا انتخاب کیا۔

اِس دنیا میں یہی انسان کا امتحان ہے۔ جو لوگ دوسرے کی طرف پتھر پھینکیں، وہ امتحان میں ناکام ہوئے۔ اس کے برعکس، جو لوگ دوسروں کا استقبال خدا کے کلام سے کریں، وہ کامیاب ٹھہرے، کیوں کہ انھوں نے وہ طریقہ اختیار کیا جو فرشتوں کا طریقہ ہے۔ کشمیر کے مسلمانوں کا یہ نیا فیصلہ، کشمیر کے لیے ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ یہ تاریک رات کے بعد روشن صبح کے طلوع کا اعلان ہے۔

قرآن کی طاقت

قرآن دلوں کو مسخر کرنے والی کتاب ہے۔ تاریخ میں کثرت سے اِس کی مثالیں موجود ہیں جب کہ قرآن نے کسی فرد یا گروہ کے اندر اپنی نظریاتی طاقت سے، انقلاب پیدا کر دیا۔ قرآن، خدا کی کتاب ہے اور انسان، خدا کی مخلوق۔ قرآن کی یہی وہ صفت ہے جس نے قرآن کے اندر انسانوں کو مسخر کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی ہے۔

اِس معاملے کی ایک تاریخی مثال مصر ہے۔ دورِ اول کے مسلمان جب مصر میں داخل ہوئے، اُس وقت مصر کے لوگ قبطی زبان بولتے تھے، اور وہ شرک کے مذہب پر قائم تھے۔ قرآن کے اثر سے انھوں

نے نہ صرف اپنے مذہب کو تبدیل کیا، بلکہ انھوں نے قرآن کی زبان (عربی) کو بھی اپنی زبان بنالیا۔

مصریات کے ایک برٹش مورخ سر آرتھر کیتھ (Sir Arthur Keith) نے اِس واقعے کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے — مصر کے لوگ تلوار سے مفتوح نہیں ہوئے، بلکہ وہ قرآن سے مفتوح ہوئے:

The Egyptians were conquered not by the sword, but by the Quran.

قرآن دوبارہ اپنے اِس فاتحانہ کردار کو ادا کرسکتا ہے، بشرطیکہ قرآن کو ماننے والے غیر قرآنی سرگرمیوں کو چھوڑ دیں اور وہ قرآن کے پرامن پیغام کو دنیا کے لوگوں تک پہنچا دیں۔

اسلام کی بہار

جون 1989 میں، میں نے کشمیر کا سفر کیا تھا۔ ایک کشمیری مسلمان نے بتایا کہ اِس سفر کے دوران میں نے سری نگر کی ایک مجلس میں کہا تھا کہ — کشمیر میں مجھ کو اسلام کی بہار دکھائی دیتی ہے۔

کشمیر کے بارے میں یہ بات میں نے کشمیر کے بالفعل (actual) کو لے کر نہیں کہی تھی، یہ بات میں نے کشمیر کے بالقوہ (potential) کو لے کر کہی تھی۔

کچھ نادان لیڈروں نے کشمیریوں کے جذبات کو بھڑکا کر یہاں سیاست کی گرم ہوائیں چلا دیں، لیکن یہ بات کشمیریوں کے اصل مزاج کے مطابق نہیں۔ کشمیری لوگ اپنے مزاج کے اعتبار سے، امن پسند لوگ ہیں۔ اگر اُن کو صحیح رہنمائی مل جائے تو یقینی طور پر یہاں ایسا ہوگا کہ خزاں کے موسم کی جگہ بہار کا موسم آجائے۔ تشدد کی گرم ہواؤں کے بجائے یہاں امن کی ٹھنڈی اور خوش گوار ہوائیں چلنے لگیں۔ یہاں دوبارہ سیاسی اسلام کے بجائے، ربانی اسلام کا دور دورہ ہوجائے۔

کشمیر میں اسلام کی بہار آنے کا پورا امکان ہے، لیکن یہ امکان اپنے آپ واقعہ نہیں بن سکتا۔ اِس کے لیے ضرورت ہے کہ اسلام کی پرامن تعلیمات کو یہاں کے لوگوں میں عام کیا جائے۔ لوگوں کے درمیان شعوری تعمیرِ نو (intellectual re-engineering) کی تحریک چلائی جائے۔ لوگوں کو بتایا جائے کہ نفرت اور تشدد اُن کے لیے کوئی انتخاب نہیں۔ اُن کے لیے انتخاب صرف ایک ہے، اور وہ امن اور محبت ہے۔ اِسی میں ان کی دنیا کی کامیابی چھپی ہوئی ہے اور اِسی میں اُن کی آخرت کی کامیابی بھی۔

کشمیر کا خواب

ایک مسلم نوجوان اگست 2008 میں نئی دہلی سے کشمیر گئے۔ وہاں وہ تین ہفتہ رہے۔ ان کی عادت ہے کہ وہ روزانہ اپنی ڈائری لکھتے ہیں۔ وہ کشمیر سے واپس آئے تو انھوں نے مجھ کو اپنی ڈائری دکھائی۔ ان کی اِس ڈائری کا ایک اندراج یہ تھا:

''4 اگست 2008 کی ایک رات کو میرا قیام کشمیر کے ایک تعلیمی ادارہ میں تھا۔ وہاں ادارے کے ایک طالب علم بھی موجود تھے۔ صبح کو میں بیدار ہوا تو مذکورہ طالب علم نے ماہ نامہ الرسالہ سے متعلق اپنا ایک خواب بیان کیا، جو اُنھیں کے الفاظ میں اِس طرح تھا: ''میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص ہے۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی سفید داڑھی ہے۔ وہ ان پڑھ ہے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ — مجھے الرسالہ کا ممبر بناؤ، مجھے الرسالہ کا ممبر بناؤ۔'' اِس خواب میں مذکورہ بوڑھا آدمی گویا کشمیر کی روح ہے۔ کشمیر کی روح چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ جو منفی افکار میرے درمیان پھیلائے جارہے ہیں، اُن سے میں بے زار ہوں، ان کو بند کرو۔ میرے درمیان الرسالہ کو پھیلاؤ، میرے درمیان الرسالہ والے مثبت افکار کو عام کرو۔

کشمیر میں اکتوبر 1989 میں متشددانہ تحریک کا آغاز ہوا۔ اِس متشددانہ تحریک کے دوران کشمیر میں جان ومال کا بے حساب نقصان ہوا ہے۔ اِس خود ساختہ جہاد نے کشمیر کو تباہی کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔

اب کشمیر کی سلامتی کی صرف ایک صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ کشمیر میں اُن افکار کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے جس کا پیغام ماہ نامہ الرسالہ میں مسلسل طور پر دیا جارہا ہے۔ اِسی میں کشمیر کے لیے زندگی ہے۔ اِس کے سوا جو کچھ ہے، وہ موت اور تباہی کے سوا کچھ اور نہیں۔ نام نہاد کشمیری تحریک سے کچھ لیڈروں کو فائدہ ہوسکتا ہے، لیکن خود کشمیر یا کشمیری عوام کا اس میں کچھ فائدہ نہیں — اب آخری وقت آگیا ہے کہ اِس معاملے میں نظر ثانی کی جائے اور جذباتیت کو چھوڑ کر حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

اسلام کے نام پر غیر اسلام

مارچ 2012 کا واقعہ ہے۔ ایک انتہا پسند ہندو لیڈر انڈیا کے ایک شہر میں پہنچے۔ وہاں ان کی تقریر ہوئی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ مکہ کا کعبہ اصل میں بتوں کا مندر تھا۔ مسلمانوں نے قبضہ کرکے اُس کو اپنی مسجد بنا لیا۔ اِس تقریر پر وہاں کے مسلمان مشتعل ہوگئے۔ انھوں نے وہاں جلوس نکالا، پُر جوش نعرے

لگائے۔ اِس کے نتیجے میں وہاں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ مقامی لوگوں کو جان ومال کا کافی نقصان برداشت کرنا پڑا۔

مسلمانوں کا یہ ردعمل سرتاسر ایک قومی ردعمل تھا، اُس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اِن مسلمانوں کے اندر اگر صحیح ذہن ہوتا تو وہ سوچتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب 610 عیسوی میں توحید کا مشن شروع کیا تو اُس وقت عملاً ایسا تھا کہ کعبہ میں کئی سو کی تعداد میں بت رکھے ہوئے تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اِس پر مشتعل نہیں ہوئے، بلکہ پُرامن انداز میں آپ لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے رہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اِس طرح کی بے بنیاد تقریر پر مشتعل نہ ہوں، بلکہ اُسے نظر انداز کردیں، وہ اِس واقعہ کو ایک موقع کے طور پر استعمال کرتے ہوئے لوگوں کو اسلام کا پیغام پہنچائیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ مسلمان کس طرح پیغمبر کے نام پر غیر پیغمبرانہ روش کا ارتکاب کررہے ہیں۔ وہ اسلام کے نام پر ایسی تحریکیں چلاتے ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، ایسے مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ معاملہ اِسی دنیا میں ختم نہیں ہوجائے گا۔ آخرت میں اُن سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے ایسا دین کہاں سے ایجاد کرلیا جس کو اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے بھیجا نہیں تھا۔ اِس طرح کی غوغائی سیاست بلاشبہہ اسلام کے خلاف ہے، اُس کو کبھی خدا کی نصرت ملنے والی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں اِس قسم کے ہنگامے ہر جگہ صرف مسلمانوں کے حالات کو بگاڑنے کا سبب بن رہے ہیں، نہ کہ حالات کے درست کرنے کا سبب۔

جذباتی سیاست کا نقصان

1947 کے بعد کشمیر کی ریاست انڈیا اور پاکستان کے درمیان ایک نزاعی اشو بن گئی۔ اب بے شمار نقصانات کے بعد پاکستان نے اِس معاملے میں دانش مندانہ پالیسی اختیار کی ہے۔ پاکستانی حکومت نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ انڈیا کو موسٹ فیورڈ نیشن (Most-Favoured Nation) کا درجہ دے دیا جائے۔ اِس کی رپورٹ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (یکم مارچ 2012، صفحہ 15)۔ اِس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ انڈیا نے پاکستان کو 1996 میں موسٹ فیورڈ نیشن کا درجہ دے دیا تھا۔ اِس کے جواب میں پاکستان کو بھی یہی کرنا چاہیے تھا، مگر پاکستانی لیڈروں نے ایسا کرنے میں بہت دیر کی۔

وہ ڈرتے تھے کہ کشمیر کے بارے میں حساس پاکستانی عوام اِس کے خلاف سخت ردعمل کا اظہار کریں گے۔

اِس واقعے میں لیڈرشپ کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ لیڈرشپ کو کبھی ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ وہ کسی اِشو پر جذباتی انداز اختیار کرے، وہ اس کے بارے میں ہائی پروفائل میں بولنے لگے۔ اِس قسم کا طریقہ لیڈرشپ کے لیے ایک غیر دانش مندانہ طریقہ ہے، کیوں کہ عوام کو اگر ایک بار جذباتی تقریریں کرکے بھڑکا دیا جائے تو وہ حقیقت پسندانہ مزاج کھودیتے ہیں۔ اِس کے بعد خواہ حالات کتنے ہی بگڑ جائیں، وہ یوٹرن (U Turn) لینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اُن کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ — خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے، لیکن ہم اِس مسئلے پر مفاہمت نہیں کریں گے۔

اِس قسم کا مزاج کسی قوم کی ترقی کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں جذباتی انداز کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ اجتماعی زندگی نام ہے — اپنی سوچ اور فریقِ ثانی کی سوچ کے درمیان ایڈجسٹمنٹ تلاش کرنے کا۔ اجتماعی زندگی کے معاملات یک طرفہ بنیاد پر طے نہیں ہوتے، بلکہ وہ دوطرفہ بنیاد پر طے ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں جذباتی سیاست کا طریقہ ایک سنگین رکاوٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اجتماعی زندگی کے معاملات یا تو فریقِ ثانی کی رعایت کے ذریعے حل ہوتے ہیں، یا وہ کبھی حل نہیں ہوتے۔

دعوتی طرزِ فکر

ایک کشمیری مسلمان ہمارے دعوتی مشن سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے ٹیلی فون پر بتایا کہ 23 ستمبر 2010 کو کشمیر میں پبلک انٹریکشن (Public Interaction) کے عنوان کے تحت حکومت کی طرف سے ایک پروگرام ہوا۔ اِس میں انڈین آرمی کے اعلیٰ افسران اور مقامی مسلمان موجود تھے۔ اِس پروگرام کے مہمانِ خصوصی مسٹر گُردیپ سنگھ، جنرل کمانڈنگ آفیسر (GCO) اور مسٹر انل پانڈے (بریگیڈیر) تھے۔ مذکورہ ساتھی نے بتایا کہ اِس موقع پر ایک کشمیری مسلمان نے اپنا ذاتی تاثر بیان کرتے ہوئے کہا کہ حکومت نے مسئلۂ کشمیر کو تجارت بنالیا ہے، یہ لوگ اب کشمیر کے نام پر صرف سیاسی تجارت کررہے ہیں۔

میں نے مذکورہ مسلمان سے کہا کہ میں نے بھی قرآن (61:10-11) کے مطابق، ایک تجارت شروع کی ہے۔ اِس کے بعد ہمارے ساتھی پبلک انٹریکشن کے اِس پروگرام میں قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر لے کر پہنچے۔ وہاں انھوں نے لوگوں کو مطالعہ کے لیے قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر

دیا۔ انھوں نے مسٹر گردیپ سنگھ اور مسٹر انل پانڈے کو ترجمہ قرآن کے علاوہ، ہمارے یہاں سے شائع ہونے والی کتاب ''پرافٹ آف پیس'' مطالعہ کے لیے دی۔ اِس کے بعد مسٹر گردیپ سنگھ نے اپنی تقریر میں کہا کہ حال میں، قرآن برننگ کے اشو کو لے کر آپ لوگوں نے کشمیر میں ہنگامہ کیا، جس کے نتیجے میں یہاں 17 نوجوان ہلاک ہوگئے۔ مسٹر گردیپ سنگھ نے قرآن کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا کہ آپ لوگ قرآن کے نام پر تشدد (violence) کرتے ہیں۔ مجھ کو بتائیے کہ قرآن کی کس آیت میں تشدد کا حکم دیا گیا ہے۔ اِس سوال پر تمام مسلمان خاموش رہے۔

اگر آدمی کے اندر دعوتی ذہن موجود ہو تو وہ اِس قسم کے ہر موقع کو دعوت کے لیے استعمال کرے گا، وہ ایسے موقع پر اللہ کے بندوں کو اللہ کے کلام کا تحفہ پیش کرے گا۔ اس کے برعکس، اگر آدمی کا ذہن دعوتی طرز فکر سے خالی ہو تو اس کو ایسا ہر دعوتی موقع محض ''سیاست'' کا ایک اسٹیج معلوم ہوگا۔ ایسے موقع پر دوسروں کو دینے کے لیے اس کے پاس صرف نفرت کا تحفہ ہوگا، نہ کہ محبت کا تحفہ۔

دورِ جدید: دورِ مدعو

قدیم زمانے میں عالمی سیاحت (tourism) کا کوئی تصور نہ تھا۔ اِس لیے کہ قدیم زمانے میں سفر کے ذرائع موجود نہیں تھے۔ موجودہ زمانے کو دورِ مواصلات (age of communication) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں سفر کے وسائل اور جغرافیہ کے علم کی بنا پر ایسا ہوا کہ سفر بہت زیادہ بڑھ گیا۔ لوگ بڑی تعداد میں اِدھر سے اُدھر جانے لگے، یہاں تک کہ کہا جانے لگا کہ موجودہ زمانے میں پوری دنیا ایک عالمی گاؤں (global village) بن گئی ہے۔

دعوت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اسفار کی کثرت کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ محض مسافروں کی نقل وحرکت (mobility) نہیں، بلکہ وہ مدعو کی نقل وحرکت ہے۔ جدید کمیونکیشن سے پہلے داعی اور مدعو کے درمیان فاصلہ ہوا کرتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ مدعو خود تیز رفتار سواریوں کے ذریعے سفر کر کے داعی کے پاس پہنچ رہا ہے۔ مختلف اسباب سے، داعی اور مدعو کے درمیان مادی اور ذہنی فاصلے ختم ہو چکے ہیں۔ اِس اعتبار سے، جدید دور کو مدعو کا دور کہا جائے تو وہ بالکل درست ہوگا۔

یہ صورت حال پوری دنیا میں پیش آئی ہے۔ مگر جو علاقے سیاحتی علاقے کہے جاتے ہیں، ان کے بارے

میں یہ بات مزید اضافے کے ساتھ درست ہے۔ اِنھیں علاقوں میں سے ایک علاقہ ریاست جموں وکشمیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جموں وکشمیر میں جتنی زیادہ آبادی ہے، تقریباً اتنے ہی سیاح (tourist) وہاں ہر سال پہنچتے ہیں، ریاست جموں وکشمیر کے مسلمانوں کو یہ خصوصی موقع حاصل ہے کہ وہ مدعو کے اس گروہ کو اللہ کا پیغام پہنچائیں۔

اِس کام کے لیے سب سے زیادہ آسان طریقہ یہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ اور دوسری اسلامی کتابیں اُن کو پڑھنے کے لیے دی جائیں۔ مدعو کا یہ گروہ ریاست جموں وکشمیر کے ہر علاقے میں موجود رہتا ہے۔ اگر کشمیری مسلمانوں کے اندر دعوت کی اسپرٹ زندہ ہو تو وہ اپنے قریبی مقامات پر ہر صبح وشام دعوت کے مواقع پا جائیں گے۔

دو بہتر میں سے ایک

دعوت الی اللہ کا مشن ایک خدائی مشن (divine mission) ہے۔ ایسے ایک مشن کے لیے قرآن میں، **إحدى الحسنيين** (9:52) کی خوش خبری دی گئی ہے، یعنی اس کے لیے یہ مقدر ہے کہ دو میں سے ایک بہتر (one of the two best things) اُس کو ضرور حاصل ہو۔ پہلا بہتر نظریاتی ہے، اور دوسرا بہتر عملی۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ سچے خدائی مشن کے لیے دو میں سے ایک کامیابی مقدر ہے — یا تو کامیابی بہ معنیٰ تبلیغ، یا کامیابی بہ معنیٰ انقلاب۔

موجودہ زمانے میں جن مقامات پر جہاد کے نام سے تشدد کا کلچر چلایا گیا، وہاں فرض کے درجے میں ضروری ہے کہ ایسے لوگ اٹھیں جو اُس کی اصلاح کی کوشش کریں، جو اِن مسلمانوں کو اُن کی غلطی سے آگاہ کریں، جو اُن کو تشدد سے امن کی طرف بلائیں، جو اُن کو بتائیں کہ تمھارا کام لوگوں کو حق کی دعوت دینا ہے، نہ کہ اُن سے ٹکراؤ کرنا۔ تمھارا ایمانی فریضہ ہے کہ تم، لوگوں کے ساتھ مدعو کا سلوک کرو، نہ کہ دشمن کا سلوک۔ تم کو چاہیے کہ تم اپنے ماحول میں خیر خواہی کا کلچر چلاؤ، نہ کہ نفرت اور رقابت کا کلچر۔ اِس قسم کی مہم دوسرے مسلم علاقوں میں بھی ضروری ہے اور کشمیر میں بھی ضروری۔ اِس قسم کی مہم اِس یقین کے ساتھ شروع کی جاسکتی ہے کہ اس کے لیے ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔

اِس مہم کے کارکنوں کے لیے یقینی طور پر دو میں سے ایک انجام مقدر ہے — یا تو وہ لوگوں تک اپنی بات پہنچانے میں کامیاب ہوں گے اور اللہ کے یہاں اُس کا عظیم انعام حاصل کریں گے، یا ایسا ہوگا کہ لوگ ان کی بات کو مان لیں اور وہ عملی اعتبار سے اپنی زندگی کو بدلنے پر راضی ہو جائیں۔ یہ وہی چیز ہے جس کو

قرآن میں 'إحدى الحسنيين' کہا گیا ہے، یعنی یا تو نظریاتی اعتبار سے، دعوتِ حق کی کامیابی، یا عملی اعتبار سے لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب لانے کی کامیابی۔

غیر نہیں، مدعو

عام طور پر لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کو ''اپنے'' اور ''غیر'' میں تقسیم کرتے ہیں، مگر اسلام کا طریقہ یہ نہیں۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ انسانوں کو مدعو کی نظر سے دیکھا جائے۔ اپنے اور غیر کی تقسیم میں، اپنا قابلِ محبت نظر آتا ہے، اور دوسرا قابلِ نفرت دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہی موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمان اِس حقیقت کو بھول گئے ہیں کہ اپنے عقیدہ کے اعتبار سے، وہ داعی ہیں اور دوسرے تمام انسان ان کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ داعی-مدعو کی تقسیم میں کوئی غیر نہیں رہتا، بلکہ سارے انسان اپنے نظر آنے لگتے ہیں۔

آج کل عام طور پر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ دوسری قوموں کو اپنا حریف (rival) بنائے ہوئے ہیں۔ اگر وہ دوسری قوموں کو اپنا مدعو سمجھیں تو تمام انسان ان کو اپنے نظر آنے لگیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی شخص کے جنازے کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہود بھی ہماری طرح انسان ہیں (صحيح البخاري، رقم الحديث: 1312)۔ مسلمان اِس اسوۂ رسول کو اختیار کرلیں تو تمام قوموں کے لوگ ان کو اپنے نظر آنے لگیں گے — کشمیریوں کو ہندو اپنا نظر آئے گا، عربوں کو اسرائیلی اپنا دکھائی دے گا، مغربی ملکوں میں مقیم مسلمان وہاں کے عیسائیوں کو اپنا سمجھنے لگیں گے، وغیرہ۔

دوسروں کو اپنا سمجھنے کا مطلب دوسروں کا خیر خواہ بننا ہے۔ ایک تاجر ہر انسان کو اپنا کسٹمر سمجھتا ہے۔ اِس مزاج کے نتیجے میں تاجر کے اندر ہر ایک کے لیے دوستانہ سلوک (friendly behaviour) پیدا ہوتا ہے۔ اِسی طرح مسلمان اگر اپنے کو داعی اور دوسروں کو مدعو سمجھیں تو ان کے اندر دوسروں کے لیے خیر خواہی (well-wishing) کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اُن کے اندر تمام انسانوں کے لیے دوستانہ کلچر (friendly culture) پرورش پائے گا۔ اِس کے نتیجے میں ان کی دنیا کے معاملات بھی درست ہوجائیں گے اور آخرت میں بھی وہ خدا کی رحمتوں کے مستحق قرار پائیں گے۔

نظریے کی طاقت

روس میں اشتراکی انقلاب 1917 میں پیش آیا۔ اِس سے پہلے روس میں بادشاہ کی حکومت تھی جس کو

زار (Czar) کہا جاتا تھا۔ اُس وقت کمیونسٹ پارٹی نے زار کے خلاف ایک نظریاتی جنگ شروع کی۔ یہ نظریاتی جنگ بہت تیزی سے پورے ملک میں پھیلنے لگی۔ برطانیہ نے اِس کو اپنے لیے ایک خطرہ سمجھا۔ چناں چہ کرنل بیلی (F M Bailey) کی قیادت میں ایک وفد روس بھیجا گیا۔ یہ وفد وہاں تاجر کے روپ میں گیا تھا۔ اِس وفد نے روس کے حالات کا جائزہ لے کر جو رپورٹ حکومتِ برطانیہ کو پیش کی، اُس کا ایک جملہ یہ تھا— اشتراکی نظریات جو یہاں پھیلائے جا رہے ہیں، وہ زار کی پوری فوج سے زیادہ خطرناک ہیں:

> Communist ideas are far more dangerous than the entire army of king Czar.

تاریخ میں اِس طرح کے متعدد واقعات ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ فوجی طاقت کے مقابلے میں، نظریے کی طاقت زیادہ بڑی ہوتی ہے۔ اسلام کی تاریخ اِس حقیقت کی ایک ممتاز مثال ہے۔ قدیم تاریخ میں اسلام کی کامیابی ہمیشہ نظریہ یا آئڈیالوجی کی بنیاد پر ہوئی ہے، نہ کہ تلوار یا فوجی طاقت کی بنیاد پر۔

مثال کے طور پر تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاری قبائل کے حملے نے عباسی سلطنت کو مغلوب کرلیا۔ یہ غلبہ اتنا شدید تھا کہ مسلمانوں کی فوجی طاقت اس کے مقابلے میں غیر موثر ثابت ہوئی۔ اُس وقت اسلام کی نظریاتی طاقت ابھری۔ صرف نصف صدی کے اندر یہ واقعہ پیش آیا کہ تاتاری قبائل کی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا۔ اسلام کے دشمن، اسلام کے دوست بن گئے۔

اسلام کی اِس نظریاتی طاقت کو ایک مستشرق نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے— مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کرلی، جہاں اُن کی تلوار ناکام ہوچکی تھی:

> The religion of Muslims has conquered, where their arms had failed.

شہادتِ حق، دعوتِ حق

کلمہ شہادت، اسلام میں داخلے کا دروازہ ہے۔ ایک شخص جب اسلام کی سچائی کو دریافت کرتا ہے اور اس کے اندر یہ جذبہ جاگتا ہے کہ وہ حشر کے دن اللہ کے سامنے ایک مسلم کی حیثیت سے حاضر ہو تو وہ اپنی زبان سے یہ کلمہ ادا کرتا ہے: **أشهد أن لا إله إلا الله، و أشهد أن محمداً عبده و رسوله** (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد، اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں)۔

اِس کلمہ کے دو پہلو ہیں بی شہادت، اور انطباقی شہادت (applied shahadah)۔ شہادت کا ابتدائی مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی ذات کے اعتبار سے، اِس بات کا اعلان کرے کہ اِس کائنات کا خالق اور مالک صرف ایک اللہ ہے، وہ اِس حقیقتِ اعلیٰ کا گواہ (witness) بن جائے۔ اِس شہادت کا دوسرا پہلو انطباقی شہادت ہے، یعنی دوسرے انسانوں کو اِس حقیقت سے باخبر کرنا۔ اِس بات کی کوشش کرنا کہ جس حقیقتِ اعلیٰ کو اُس نے دریافت کیا ہے، اُس حقیقتِ اعلیٰ سے کوئی بھی شخص بے خبر نہ رہے۔ یہ وہی کام ہے جس کو دوسرے الفاظ میں، دعوت الی اللہ کہا جاتا ہے۔ دعوت کا عمل جب اپنی انتہائی صورت میں انجام پائے، تو اِسی کا دوسرا نام شہادت یا گواہی ہے۔

دعوت الی اللہ کا کام ایمان سے الگ کوئی کام نہیں۔ جب کسی شخص کو حقیقی طور پر ایمان حاصل ہوتا ہے، تو فطری طور پر وہ اِس کے لیے بے تاب ہوجاتا ہے کہ جس سچائی کو اُس نے جانا ہے، اُس سچائی کو دوسرے لوگ بھی جان لیں۔ زندگی کا جو مقصد اُس نے دریافت کیا ہے، وہ مقصد دوسرے لوگوں کے لیے بھی ان کی دریافت بن جائے۔ دنیا اور آخرت کی سعادت کا جو راز اُس پر کھلا ہے، اس سے دنیا کے دوسرے لوگ محروم نہ رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شہادت اگر ذاتی دریافت کا معاملہ ہے، تو انطباقی شہادت دوسروں کو اِس دریافت میں شریک کرنے کا معاملہ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر عرفات کے میدان میں اپنے اصحاب کو گواہ بناتے ہوئے اُن کے سامنے ایک تاریخی خطاب کیا تھا۔ یہ خطاب اصحابِ رسول کے واسطے سے پوری امتِ محمدی کے لیے ہے۔ اِس خطاب میں آپ نے فرمایا تھا: اِنّ اللّٰہ بعثنی رحمۃً للناس کافّۃً، فأدّوا عنّی (معرفۃ الصحابۃ لأبی نُعیم، رقم الحدیث: 3438) یعنی اللہ نے مجھ کو دنیا کے تمام انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، پس تم میری طرف سے تمام انسانوں کو میرا پیغامِ رحمت پہنچا دو۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آواز تاریخ میں گونجتی ہوئی تمام مسلمانوں تک پہنچ رہی ہے۔ اِسی طرح وہ اہلِ کشمیر سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہی ہے کہ اے کشمیر کے مسلمانو، تم میرے مشن کو پورا کرو اور تمام انسانوں تک میرا پیغام پہنچانے میں میرے مددگار بن جاؤ۔ کیا کشمیر کے مسلمان پیغمبر اسلام کی اِس آواز پر لبیک کہیں گے۔

امن کی وادی

کشمیر میں ہر طرف فطرت کے مناظر ہیں ہی سرسبز درخت، پانی کے چشمے، بہتے ہوئے دریا، چڑیوں کی چہچہاہٹ، پھلوں اور پھولوں کی بہاریں، اِس طرح پورا کشمیر فطرت کا گارڈن نظر آتا ہے۔ کشمیر کا یہ سرسبز ماحول اپنی خاموش آواز میں پکار رہا ہے کہ یہاں نفرت اور عداوت کے لیے کوئی جگہ نہیں، یہاں تشدد کا کلچر چلانا خدا کے تخلیقی منصوبہ کے خلاف ہے، اور جو چیز خدا کے تخلیقی منصوبہ کے خلاف ہو، وہ کبھی خدا کی اِس دنیا میں کامیاب ہونے والی نہیں۔

کشمیر میں 2012 کے موسم سرما میں بڑی مقدار میں اسنو فال (snow fall) ہوا۔ اسنو فال ایک خوب صورت فطری ظاہرہ (natural phenomenon) ہے۔ کسی نے درست طور پر کہا ہے کہ اسنو فال ایک قسم کی روحانی بارش (spiritual rain) ہے۔

13 فروری 2012 کو ایک کشمیری مسلمان کی طرف سے موبائل پر ہمارے ایک ساتھی کو یہ میسج (SMS) ملا: کشمیر اِس وقت اسنو فال کی وجہ سے سفید ہو رہا ہے۔ سفیدی، امن کی علامت ہے۔ یہ فطرت کا سبق ہے، اور فطرت کے اِس پیغام کی خلاف ورزی صرف تباہی تک پہنچانے والی ہے:

Today Kashmir is white due to snow fall. White is the symbol of peace. This is the lesson from nature, and violation of the law of nature always leads to destruction.

کشمیری مسلمان کا یہ پیغام گویا کشمیر کی روح کی ایک پکار ہے۔ کشمیر کی روح، فطرت کی زبان میں یہ پکار رہی ہے کہ کشمیر اپنی تخلیق کے اعتبار سے، امن کی ایک وادی ہے۔ کشمیر کو اس کے خالق نے اِس لیے چنا ہے کہ وہ دنیا کو امن کا پیغام دے۔ وہ فطرت کا ایک ایسا گہوارا بنے جہاں سے خدا کے بندوں کو امن اور انسانیت کا پیغام ملے۔ یہی کشمیر کا اصل رول ہے، اہلِ کشمیر کے لیے ترقی اور کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ خدا کے عطا کئے ہوئے اپنے اِس رول کو پہچانیں اور اُس کو بھر پور طور پر انجام دیں۔

یہ وعدہ خلافی کا معاملہ نہیں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ میں خلافت کے سوال پر مہاجرین اور انصار کے درمیان اختلاف پیدا ہوا۔ انصار کا یہ کہنا تھا کہ: منا أمیر، ومنکم أمیر (ایک امیر مہاجرین میں سے اور

ایک امیر انصار میں سے)۔ آخر کار حضرت عمر کے اس قول پر فیصلہ ہوا: نحن الأمراء، وأنتم الوزراء (مہاجرین میں سے امیر ہوں اور انصار میں سے وزیر)۔ لیکن بعد کو اِس وعدے پر عمل نہ ہوسکا۔ حضرت عمر فاروق نے اپنے آخری زمانے میں کہا کہ ہم نے انصار سے وعدہ کیا تھا کہ ہم خلافت کے کام میں انصار کو وزیر بنائیں گے، لیکن ہم ایسا نہ کرسکے: واللہ ماوفینا لہم، کما عاہدناہم علیہ (مسند البزار، رقم الحدیث: 281)

یہ وعدہ خلافی کی بات نہ تھی، بلکہ وہ اجتماعی حکمت کی بات تھی۔ اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ جب کوئی وعدہ کیا جائے تو اُس کو پورا کیا جائے، مگر یہ حکم انفرادی معاملات کے لیے ہے۔ انفرادی معاملات میں ایک فرد کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر اپنے وعدے کو پورا کرسکے، اِس لیے فرد کے اوپر یہ لازم ہے کہ جب وہ کسی سے وعدہ کرلے تو وہ اُس کو ہر حال میں پورا کرے، وہ کسی بھی عذر کی بنا پر اپنے وعدے کے خلاف عمل نہ کرے۔

مگر اجتماعی زندگی کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ جو وعدہ سیاسی اور اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتا ہو، وہ عام معنوں میں ایک وعدہ نہیں ہوتا۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، چوں کہ اجتماعی حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے، مختلف قسم کے تقاضے اُس کے اوپر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں، اِس لیے اِس قسم کے وعدے کبھی حتمی نہیں ہوتے، وہ حالات کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ اجتماعی وعدوں کے معاملے میں طرفین کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ حالات کے تقاضے کو سمجھیں۔ وہ ابتدائی الفاظ پر اصرار کرنے کے بجائے بعد کے پیدا شدہ حالات سے مطابقت پر راضی ہوجائیں۔ اجتماعی زندگی کے معاملات کبھی آئڈیل وزڈم (ideal wisdom) پر طے نہیں ہوتے، وہ ہمیشہ پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) پر طے ہوتے ہیں۔ یہی اسلام کا تقاضا ہے، اور یہی عقل کا تقاضا بھی۔

ٹکراؤ سے اعترافِ حقیقت تک

میڈیا میں دو خبریں ایک ساتھ آئی ہیں۔ ایک، یہ کہ پاکستانی لیڈرشپ نے کشمیر کے اِشو کو وقتی طور پر ختم کردیا ہے۔ یہ خبر نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (27 فروری 2012) میں اِس عنوان کے تحت چھپی ہے۔ پاکستان، کشمیر کے اشو کو وقتی طور پر ردّی اشیا کے خانے میں ڈال سکتا ہے:

Pakistan may junk Kashmir issue temporarily

دوسری خبر کا خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان کے شہر ایبٹ آباد میں اسامہ بن لادن کا خفیہ رہائشی کمپاؤنڈ واقع تھا۔ 2 مئی 2011 کو امریکا نے ایک ٹارگیٹڈ اٹیک (targetted attack) کے ذریعے وہاں اسامہ بن لادن کو ہلاک کر دیا۔ اب خبر ہے کہ خود پاکستانی حکومت نے اسامہ بن لادن کے اِس رہائشی کمپاؤنڈ کو 25 فروری 2012 کو رات کے اندھیرے میں ڈھا دیا۔ اُس کا ملبہ وہاں سے دور پھینک دیا ہے۔ اِس واقعے کی تصویر ٹائمس آف انڈیا (27 فروری 2012) کے صفحہ 18 پر شائع ہوئی ہے۔

اِن دونوں خبروں کا خلاصہ صرف ایک ہے، وہ یہ کہ کشمیر میں جہاد کے نام سے جو متشددانہ جدوجہد شروع کی گئی تھی، وہ اب اپنے فطری انجام کو پہنچ کر ختم ہوگئی ہے، مذکورہ خبر میں ''وقتی طور پر'' (for the time being) کا لفظ محض ڈپلومیٹک ہے۔ اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے، اُس کا مطلب صرف یہ ہے کہ پاکستان نے اب ہمیشہ کے لیے اِس بے نتیجہ اشو کو ترک کر دیا ہے، یہاں تک کہ اب اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ پاکستان میں متشددانہ جدوجہد کی علامتوں تک کو مٹا دیا جائے۔ اِس کی ایک مثال پاکستان میں اسامہ بن لادن کی رہائش گاہ کی مسماری ہے۔

کشمیر کی نام نہاد جنگ، کشمیریوں کی اپنی آواز نہ تھی، وہ مکمل طور پر پاکستان کی برآمد کردہ جنگ (exported war) تھی۔ پاکستان نے اب حالات کی مجبوری کے تحت اُس کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں اب کشمیر کی نام نہاد جنگ کو جاری رکھنے کا نہ کوئی جواز ہے اور نہ کوئی امکان۔ اب اہلِ کشمیر کے لیے متعدد انتخابات (options) نہیں رہے۔ اب اُن کے لیے ایک ہی ممکن انتخاب ہے، یہ کہ وہ ہتھیار اور ہتھیار کی سیاست دونوں کا مکمل خاتمہ کر دیں، اور پُر امن جدوجہد کے ذریعے اپنے مستقبل کی تعمیر کریں۔

اجتماعی زندگی میں اقدام کی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک، یہ صورت کہ وہ اپنے مطلوب انجام تک پہنچے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے انجام کے اعتبار سے، کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter-productive) ثابت ہو، یعنی الٹا نتیجہ برآمد کرنے والا۔ پاکستان کی طرف سے چھیڑی ہوئی کشمیری جنگ کا یہی دوسرا انجام ہوا ہے۔ اِس جنگ میں پاکستان نے بہت زیادہ کھویا، لیکن وہ اپنے مطلوب کو نہ پا سکا۔

پاکستان کے لیے یہ ایک حقیقت پسندانہ فیصلہ ہے کہ وہ اس تباہ کُن جنگ سے اپنے آپ کو الگ کر رہا ہے، مگر اہلِ پاکستان کے لیے زیادہ بڑا مسئلہ تصحیح فکر کا ہے، یعنی منفی سوچ کو چھوڑ کر مثبت سوچ کو اختیار

کرنا۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان کھلے طور پر یہ اعلان کرے کہ کشمیر کی جنگ چھیڑنا ہماری ایک مہلک غلطی تھی۔ غلطی کے کھلے اعلان کے بغیر پاکستان کو اس کا کوئی حقیقی فائدہ ملنے والا نہیں۔ غلطی کے اعلان کا فائدہ یہ ہوگا کہ پاکستان میں ایک نئی مثبت سوچ (positive thinking) کا آغاز ہوجائے گا۔ پاکستان کے لوگ اِس معاملے میں اپنی منفی نفسیات کی بنا پر غیر حقیقت پسندانہ سوچ کا شکار ہوگئے۔ اِس طرح کا اعلان اُن کو ایک نئی رہنمائی دے گا۔ وہ مثبت سوچ میں جینے لگیں گے۔ اُن کی قومی پالیسی جواب تک غیر حقیقت پسندانہ طرزِ فکر پر کھڑی ہوئی تھی، وہ حقیقت پسندانہ طرزِ فکر پر قائم ہوجائے گی۔ یہ واقعہ پاکستان اوراس کے حلیفوں کے لیے بلاشبہہ ایک انقلابی واقعہ ہوگا۔

لیڈروں کا دہرا کردار

اسامہ بن لادن کا عمومی تشخص یہ ہے کہ وہ مغرب کے سخت دشمن تھے اور جہاد کے نام پر مغرب کے خلاف متشددانہ کارروائیوں کے سب سے بڑے حامی تھے۔ 3 مئی 2011 کو پاکستان (ایبٹ آباد) میں وہ ہلاک ہوگئے۔ یہ ان کا کردار بحیثیت ایک لیڈر تھا۔ باپ کی حیثیت سے اُن کا کردار اِس سے بالکل مختلف تھا۔

اسامہ بن لادن کے برادرِ نسبتی (brother-in-law) زکریا (Zakaria) کا ایک انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (نئی دہلی) میں سنڈے ٹائمس (لندن) کے حوالے سے چھپا ہے۔ اِس انٹرویو میں انھوں نے بتایا کہ اسامہ بن لادن نے اپنے بیٹوں اور اپنے پوتوں سے کہا تھا کہ تم لوگ یورپ اور امریکا جاؤ، وہاں اچھی تعلیم حاصل کرو، اور اچھی زندگی گزارو۔ تم کو تعلیم حاصل کرنا ہے، امن کے ساتھ رہنا ہے۔ تم وہ نہ کرو جو میں کررہا ہوں یا جو میں نے کیا:

> He told his own children and grand children, 'Go to Europe and America and get a good education, and live a good life. You have to study, live in peace and don't do what I am doing or what I have done.)The Times of India, New Delhi, February 14, 2012, p. 20(

یہ صرف ایک شخص کی بات نہیں، یہی اِس معاملے میں موجودہ زمانے کے تمام مسلم لیڈروں کا حال ہے۔ وہ دوسروں کو مغرب سے نفرت کرنا سکھاتے ہیں، وہ قوم کے بچوں کو جہاد کے نام پر تشدد کے راستے پر ڈالتے ہیں، مگر خود اپنے بچوں کے لیے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اور مغربی

ملکوں میں آباد ہو کر وہاں پر امن زندگی گزاریں۔ ایسے لیڈروں کو نصیحت کرنا بے کار ہے، کیوں کہ وہ خود اپنی روش کبھی نہیں بدلیں گے، البتہ جو لوگ نادانی میں اُن لیڈروں کا ساتھ دیتے ہیں، اُن کو چاہئے کہ وہ ہوش مندی کا طریقہ اختیار کریں۔ وہ ایسے لیڈروں کی جذباتی باتوں کو ہرگز نہ سنیں۔ وہ خود اپنی عقل سے کام لیں اور اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لئے پُرامن تعمیر کا طریقہ اختیار کریں۔

امن اور ترقی

فروری 2012 میں اسلام آباد (پاکستان) کے ایک معروف عالم انڈیا آئے۔ انھوں نے انڈیا کے مختلف شہروں کا سفر کیا۔ اِن سفروں کے دوران اُن کو یہ موقع ملا کہ وہ انڈیا کے مسلمانوں کے حالات قریب سے دیکھ سکیں۔ دہلی میں 7 فروری 2012 کو اُن سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے تعجب کے انداز میں کہا کہ بی انڈیا میں بہت زیادہ امن پایا جاتا ہے، اور انڈیا کے مسلمان کافی ترقی کر رہے ہیں۔ مذکورہ عالم کے لیے یہ بات خلافِ توقع تھی، کیوں کہ پاکستانی میڈیا کے ذریعے انھوں نے یہ سمجھا تھا کہ انڈیا کے مسلمان ہر اعتبار سے تباہی کا شکار ہیں، انڈیا کے مسلمانوں کو نہ آزادی حاصل ہے اور نہ وہ یہاں ترقی کر سکتے ہیں، وغیرہ۔

حقیقت یہ ہے کہ ترقی کا تعلق اِس سے نہیں ہے کہ مسلمانوں کا علاحدہ بلاک بنایا جائے۔ یا نظامِ مصطفی کے نام پر ہنگامہ خیز تحریکیں چلائی جائیں۔ اِس قسم کی تحریکیں ترقی کے لیے بالکل غیر متعلق ہیں۔ ترقی کے لیے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے امن اور آزادی۔ یہ دونوں چیزیں انڈیا میں پوری طرح موجود ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جس نے انڈیا کے مسلمانوں کو یہ موقع دیا کہ وہ یہاں ترقی کر سکیں۔

ترقی ہمیشہ معتدل حالات میں ہوتی ہے۔ اِسی معتدل حالت کو امن کہا جاتا ہے۔ امن کے حصول کا راز ایک لفظ میں، اسٹیٹس کوازم (statusquoism) ہے۔ جو لوگ ترقی چاہتے ہوں، اُن کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ نام نہاد انقلابی تحریکوں کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ وہ موجود صورتِ حال (statusquo) کو علی حالہ مان لیں۔ وہ موجود امکانات کو پرامن طور پر استعمال کریں اور بقیہ تمام چیزوں کو مستقبل کے خانے میں ڈال دیں۔ اِسی تعمیری طریقے کا نام دانش مندانہ منصوبہ بندی ہے۔

اِس دنیا میں کوئی نتیجہ خیز کام صرف دانش مندانہ منصوبہ کے ذریعے انجام پاتا ہے، نہ کہ جذباتی ہنگامہ آرائی کے ذریعے۔ جذباتی ہنگامہ آرائی صرف نقصان میں اضافہ کرتی ہے، وہ کسی مفید نتیجے تک پہنچنے والی

نہیں۔ یہ واقعہ اہلِ کشمیر کے لیے ایک رہنما سبق کی حیثیت رکھتا ہے۔

غیر اصولی موقف نہیں

نزاعی امور میں کبھی غیر اصولی موقف اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا موقف ہمیشہ کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہوتا ہے، یعنی الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا۔

اِس معاملے کی ایک تازہ مثال پاکستان ہے۔ پاکستان نے انڈیا کے خلاف ''لڑائی'' میں ایک غیر اصولی موقف اختیار کیا۔ انھوں نے غیر حکومتی تنظیموں کو ہتھیار دیا اوران کی فوجی تربیت کی، تاکہ وہ انڈیا کے خلاف پراکسی وار (proxy war) لڑسکیں۔ یہ کام پاکستان میں بہت بڑے پیمانے پر کیا گیا۔ پاکستان کے تمام لوگ اِس واقعے کو جانتے تھے، مگر میرے علم کے مطابق، پاکستان کے کسی بھی شخص یا جماعت نے بالاعلان اس کی مذمت نہیں کی۔ کسی نے بھی اِس معاملے میں نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہیں دیا۔ اب 60 برس سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد یہ پالیسی خود پاکستان کے لیے تباہ کن ثابت ہورہی ہے۔ اِس تباہی کی خبریں روزانہ میڈیا میں آرہی ہیں۔

یہ طریقہ سراسر اصول کے خلاف تھا۔ مسلمہ اصول کے مطابق، ہتھیار کا استعمال صرف ایک قائم شدہ حکومت کے لے جائز ہے۔ غیر حکومتی تنظیموں (NGOs) کے لیے کسی بھی عذر کی بنا پر ہتھیار اٹھانا ہرگز جائز نہیں۔ غیر حکومتی تنظیموں کے لیے صرف دو میں سے ایک کا اختیار حاصل ہے، یا تو وہ کامل طور پر امن کے دائرے میں اپنی کوشش انجام دیں، یا پھر وہ خاموشی کا طریقہ اختیار کرلیں۔ اِس کے بجائے، ہتھیار اٹھانا یا تشدد کرنا اُن کے لیے تھرڈ آپشن (third option) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اِس معاملے میں تھرڈ آپشن لینا اپنے آپ میں ایک جرم ہے، وہ ہرگز کوئی اصلاحی اقدام نہیں۔

آدمی کو چاہیے کہ اجتماعی زندگی میں جب بھی وہ کوئی اقدام کرے تو وہ عقلی طور پر جائز اقدام (rationally justified action) ہو۔ اجتماعی زندگی میں اقدام کا معاملہ بے حد نازک ہوتا ہے۔ اِس معاملے میں آدمی کو چاہئے کہ وہ جائز اقدام کرے اور اگر جائز اقدام ممکن نہ ہو تو وہ عملاً معاملے سے الگ رہ کر اس کی اصلاح کے لئے اللہ سے دعا کرے۔

دوسری غلطی نہیں

6 فروری 2012 کو پاکستان کے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے اسلام آباد میں ایک بیان

دیا۔ یہ بیان پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دونوں میں عمومی طور پر رپورٹ کیا گیا۔ اِس بیان میں انھوں نے کہا تھا کہ ”کشمیر کے لیے پاکستان اب مزید جنگ کا تحمل نہیں کرسکتا۔ انھوں نے کہا کہ اِس سے پہلے کشمیر کے لیے ہم نے انڈیا سے چار مرتبہ (1948, 1965, 1971, 1999) جنگ کی ہے، لیکن اِس جنگ سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ کشمیر کا مسئلہ صرف بات چیت کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے۔“

وزیر اعظم پاکستان کا یہ بیان ایک غلطی کے بعد دوسری غلطی کے ہم معنی ہے۔ جنگ کرنا پاکستان کی پہلی غلطی تھی۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ باہمی تعلقات کو آخری حد تک بگاڑ کر بات چیت کی پیش کش کی جائے۔ جنگ کسی سادہ واقعے کا نام نہیں۔ جنگ انتہائی قسم کا وہ منفی اقدام ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی کے اندر نفرت اور دوری کے جذبات بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ جو علاقہ پہلے صرف ایک جغرافی علاقے کی حیثیت رکھتا تھا، وہ اب اُس کے لیے وقار کا سوال (prestige issue) بن جاتا ہے، اور جب جنگ کا انجام یک طرفہ شکست کی صورت میں نکلے تو اس کے بعد فاتح فریق کے اندر اپنے موقف کی صداقت پر یقین بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

ماضی کی ناکام لڑائیوں کے یہ نتائج اب پوری طرح واقعہ بن چکے ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان جنگ سے پہلے جو معتدل فضا پائی جاتی تھی، وہ اب پوری طرح برباد ہوچکی ہے۔ ایسی حالت میں یہ امکان ختم ہوچکا ہے کہ میز کی بات چیت (negotiation) کا کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو۔ بات چیت کے لیے معتدل فضا لازمی طور پر ضروری ہے، جب کہ دونوں ملکوں کے درمیان یہ معتدل فضا اب موجود ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب خود اپنی نادانیوں کے نتیجے میں پاکستان کے لیے بات چیت کا انتخاب سرے سے باقی نہیں رہا۔ اب پاکستان کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ کشمیر کو فراموشی کے خانے میں ڈال دے۔ وہ کشمیر کے بغیر پاکستان کی تعمیر کی منصوبہ بندی کرے، وہ ملے ہوئے کی بنیاد پر پاکستان کی ترقی کی عمارت کھڑی کرے۔ پاکستان کے لیے یہی واحد دانش مندی کا طریقہ ہے۔

شاہ ہمدان مشن

(Revival of Shah Hamadan's Mission)

میر سید علی ہمدانی (وفات: 1384ء) کو ریاست جموں وکشمیر میں ”معمارِ کشمیر“ کا درجہ حاصل

ہے۔ کشمیری مسلمان عام طور پر اُن کو ’’امیرِ کبیر‘‘ کہتے ہیں۔ امیر کبیر 1379ء میں ایران سے کشمیر آئے۔ انھوں نے کشمیر میں اسلام کی تاریخ بنائی۔ موجودہ کشمیر زیادہ تر، اُنھیں کی دعوتی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کشمیر کے لوگ اُنھیں کے مشن پر قائم تھے۔

1947 میں برصغیر ہند میں جو انقلاب آیا، اُس کے ردّعمل کے طور پر کشمیر میں سیاسی تحریک اٹھی۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ یہ سیاسی تحریک اپنے نتیجے کے اعتبار سے، کشمیریوں کے لیے صرف نقصان کا باعث ثابت ہوئی۔ تاہم اِس نقصان کا ایک مثبت پہلو ہے، وہ یہ کہ سیاسی ہنگاموں کا منفی انجام کشمیریوں کے لیے ایک شاک ٹریٹمنٹ (shock treatment) ثابت ہوا۔ اب کشمیری مسلمانوں میں یہ ذہن پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنے ماضی کی طرف لوٹیں۔ وہ دوبارہ شاہ ہمدان کی طرح پُرامن دعوت کو اپنا نشانہ بنائیں۔ اِس نئے ذہن کو شاہ ہمدان کے مشن کا اِحیاء کہا جاسکتا ہے۔

میر سید علی ہمدانی ایران میں پیدا ہوئے، وہ ایرانی بادشاہ تیمور لنگ (وفات:1405ء) کے ہم عصر تھے۔ شاہ تیمور اُن سے کسی بات پر ناراض ہوگیا اور ان کو ایران سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اب امیر کبیر کے لیے ایک راستہ یہ تھا کہ وہ تیمور لنگ کے خلاف اپوزیشن کی تحریک چلائیں، مگر امیر کبیر نے اِس قسم کے سیاسی تصادم سے مکمل طور پر پرہیز کیا۔ وہ اپنے چالیس ساتھیوں کو لے کر اپنے وطن ہمدان سے نکلے۔ اِس طرح، افغانستان ہوتے ہوئے یہ قافلہ 1379ء میں کشمیر پہنچا۔

امیر کبیر کا پروگرام نہ شاہ تیمور کے خلاف ردعمل کے طور پر بنا اور نہ کشمیری مسلمانوں کے وقتی حالات سے متاثر ہوکر۔ اُس وقت کشمیر میں ایک مسلم راجہ سلطان قطب الدین کی حکومت تھی۔ اس کے اندر بہت سی اعتقادی اور عملی خرابیاں موجود تھیں۔ امیر کبیر نے سلطان کو ناصحانہ انداز کے خطوط بھیج کر اس کو اصلاحِ حال کی طرف متوجہ کیا، تاہم انھوں نے اس کو اقتدار سے ہٹانے اور اس کی جگہ صالح حکمراں کو لانے کی کوئی مہم نہیں چلائی۔ امیر کبیر نے ان تمام عوامل سے اوپر اٹھ کر سوچا اور خود اپنے مثبت فکر کے تحت اپنا پروگرام بنایا۔ یہ تمام تر ایک خاموش عملی پروگرام تھا۔

امیر کبیر اور ان کے ساتھی ریاست کے مختلف حصوں میں پھیل گئے اور پُرامن طور پر وہ یہاں کے باشندوں میں اسلام کا پیغام پہنچانے لگے۔ انھوں نے کشمیریوں کی زبان سیکھی، یہاں کے حالات سے اپنے

آپ کو ہم آہنگ کیا، اجنبی دیس میں اپنے لیے جگہ بنانے کی مصیبتیں اٹھائیں۔ اِس طرح صبر و برداشت کی زندگی گزارتے ہوئے انھوں نے اپنے پُرامن دعوتی مشن کو جاری رکھا۔

کشمیر کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ آپ لوگوں کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ کشمیر میں آپ لوگ شاہ ہمدان کے پُرامن دعوتی مشن کو زندہ کریں۔ شاہ ہمدان کو کشمیر میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے دعوت کو اپنا واحد مشن بنایا۔ شاہ ہمدان کے زمانے میں مختلف قسم کے مسائل کشمیر میں موجود تھے، سیاسی بھی اور غیر سیاسی بھی۔ لیکن انھوں نے اِن تمام مسائل کو نظر انداز کیا اور دعوت الی اللہ کو اپنا واحد نشانہ بنایا۔ اِس کے نتیجے میں اُنھیں کشمیر میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔

مذکورہ کشمیری مسلمان نے کہا کہ شاہ ہمدان کے زمانے میں، کشمیر میں بڑی تعداد میں غیر مسلم پائے جاتے تھے۔ آج تو یہاں سب کے سب مسلمان ہیں، پھر ہم کن لوگوں کے اوپر دعوتی کام کریں۔ میں نے کہا کہ کشمیر میں انٹرنیشنل دعوہ ورک کے اعلیٰ مواقع پائے جاتے ہیں۔ انڈیا کی آرمی جو بڑی تعداد میں کشمیر میں موجود ہے، اس کا ہر فرد آپ کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ کشمیر ایک سیاحتی مقام ہے، اِس لیے ساری دنیا کے سیّاح (tourists) کشمیر میں مسلسل آتے ہیں۔ اِس کے علاوہ، کشمیر میں اب بھی ہندوؤں کی ایک تعداد موجود ہے، جن کو کشمیر میں پنڈت کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح یہاں کے قدیم مندروں میں ہر سال بڑی تعداد میں یاتری آتے ہیں۔ یہ سارے لوگ آپ کے لیے مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ لوگوں کے اندر اگر دعوتی شعور پیدا ہو جائے تو آپ دیکھیں گے کہ کشمیر میں ہر طرف بہت بڑی تعداد میں مدعو پائے جاتے ہیں۔

اِسی کے ساتھ کشمیر میں دعوت کا ایک اور میدان کھلا ہوا ہے۔ یہ وہ مسلمان ہیں جو جدید افکار کی بنا پر اسلام کے بارے میں ذہنی بے اطمینانی کا شکار ہو گئے۔ یہ لوگ بھی آپ کے لیے قیمتی مدعو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غیر مسلموں کے لیے آپ کو یہ کرنا ہے کہ اسلام کو آپ اُن کی دریافت (discovery) بنائیں، اور مسلمانوں کے لیے آپ کو یہ کرنا ہے کہ اسلام کو آپ اُن کی دریافتِ نو (re-discovery) بنائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کے مسلمانوں کو ڈبل خوش قسمتی کے مواقع حاصل ہیں۔ کشمیر کو جنت نظیر کہا جاتا

ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کشمیریوں کو دنیا کی جنت دے دی۔ دوسری طرف، اللہ تعالیٰ نے کشمیر میں دنیا بھر کے مدعو بھیج دیے، تاکہ کشمیر کے مسلمان دعوتی کام کرکے آخرت کی جنت بھی حاصل کریں۔

موجودہ زمانہ پرنٹنگ پریس کا زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں دعوتی کام انتہائی حد تک آسان ہو چکا ہے۔ قرآن کا ترجمہ، اور اسلام پر چھوٹی اور بڑی کتابیں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ آپ اِن کتابوں کو اپنے ساتھ رکھئے اور ہر موقع پر اُنھیں لوگوں کو پڑھنے کے لیے دیجئے۔ اِسی طرح دوسرے تمام مواقع کو اسلام کی پُرامن اشاعت کے لیے استعمال کیجئے، خاص طور پر قرآن کا ترجمہ لوگوں کو دیجئے اور اللہ کے یہاں دعوت کا انعام حاصل کیجئے بی شاہ ہمدان نے دعوت کے ذریعے کشمیر میں کامیابی حاصل کی تھی، آپ دوبارہ کشمیر میں دعوت کے ذریعے کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔

اہلِ کشمیر میدانِ حشر میں

جموں وکشمیر کے ایک سفر میں میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ یہ واقعہ ماہ نامہ الرسالہ (جولائی، 1978) میں اِس طرح چھپا ہے: ''مرزا محمد اعظم (پیدائش 1940) راجوری میں فارسٹر (forester) ہیں۔ وہ باہر سے جب کبھی گھر آتے تو اپنے بچوں کے لیے مٹھائی وغیرہ لاتے۔ ستمبر 1975 کا واقعہ ہے۔ ایک دن وہ گھر میں داخل ہوئے تو کسی وجہ سے وہ اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ لا سکے۔ حسب معمول بچے ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کے 6 سالہ بچے ارشد محمود طارق نے اپنی پہاڑی زبان میں کہا: اگر تُساں اَساں وسطے کجھ نی آندہ، پھر تس کُھانے وسطے آئے (اگر آپ ہمارے لیے کچھ نہیں لائے تو پھر آپ کس لیے یہاں آئے)۔ بچے کا یہ جملہ مرزا محمد اعظم کو تیر کی طرح لگا۔ انھوں نے سوچا کہ بہت جلد میں اِسی طرح خدا کے یہاں جانے والا ہوں۔ اگر خدا یہ کہہ دے کہ میرے لیے تم کچھ نہیں لائے تو پھر تم یہاں کس لئے آئے ہو، اُس وقت میرے پاس کیا جواب ہوگا''۔ (صفحہ 22)

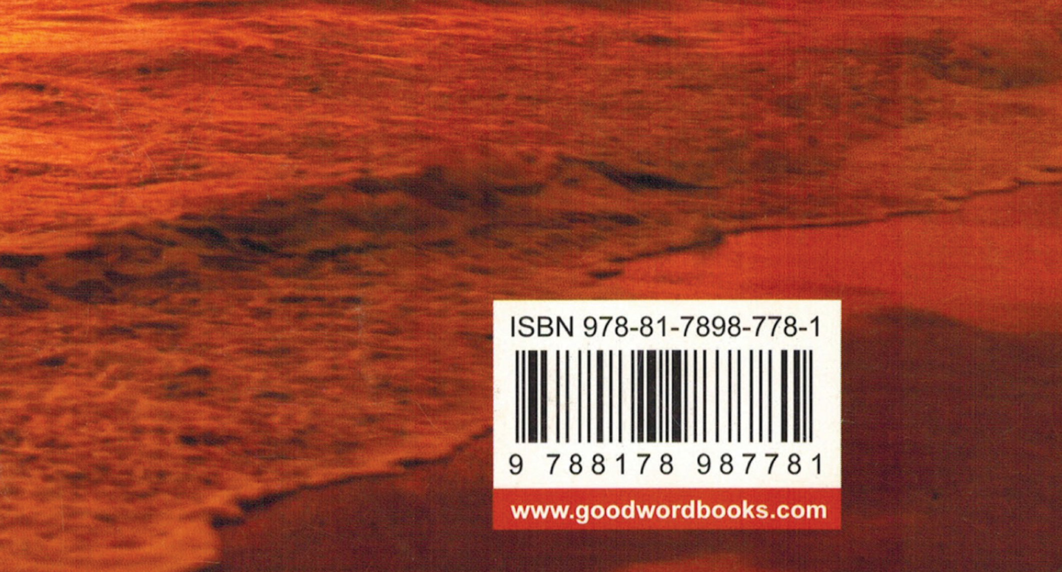
اِس واقعے میں اہلِ کشمیر کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ کشمیر ایک ایسا علاقہ ہے جہاں بڑی تعداد میں لوگ باہر سے آتے ہیں بی مغربی سیاح، ہندو یاتری اور انڈین آرمی، وغیرہ۔ اِن لوگوں کی مجموعی تعداد سالانہ تقریباً 30 لاکھ ہوتی ہے۔ یہ لوگ گویا کہ خدا کے بھیجے ہوئے مدعو ہیں۔ وہ اہلِ کشمیر کے پاس اِس لیے آتے ہیں، تاکہ اہلِ کشمیر اُن کو خدا کا پیغام پہنچائیں، وہ اُن کو خدا کے تخلیقی منصوبہ (creation plan

of God) سے آگاہ کریں۔

یہ بے حد نازک صورت حال ہے۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ قیامت برپا ہو اور اہلِ کشمیر سب کے سب، میدانِ حشر میں اللہ کے سامنے حاضر ہوں۔ اُس وقت اگر اللہ، اہلِ کشمیر سے پوچھے کہ تمھارے پاس میں نے اتنی بڑی تعداد میں ایسے انسان بھیجے جو سچائی سے بے خبر تھے۔ تمھارے پاس میرا بھیجا ہوا قرآن تھا، تم نے اُن کو سچائی سے باخبر کرنے کے لیے کیا کیا۔

اگر اہلِ کشمیر کے پاس خدا کے اِس سوال کا مثبت جواب نہ ہو اور خدا، اہلِ کشمیر سے کہہ دے کہ جب تم نے میرا کام نہیں کیا تو تم یہاں کس لیے آئے ہو۔ میدانِ حشر میں اگر اِس طرح کا واقعہ پیش آئے تو اُس وقت اہلِ کشمیر کا کیا حال ہوگا۔ اِس صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ اہلِ کشمیر سب سے زیادہ اس سوال پر سوچیں اور ایک دن ضائع کئے بغیر وہ دعوت الی اللہ کے کام کو انجام دینے میں لگ جائیں، تا کہ موت سے پہلے تمام لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچ جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ — اللہ نے مجھ کو دنیا کے تمام انسانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے، پس تم میری طرف سے تمام انسانوں کو میرا پیغامِ رحمت پہنچا دو۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آواز تاریخ میں گونجتی ہوئی تمام مسلمانوں تک پہنچ رہی ہے۔ اِسی طرح وہ اہلِ کشمیر سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہی ہے کہ — اے کشمیر کے مسلمانو، تم میرے مشن کو پورا کرو اور تمام انسانوں تک میرا پیغام پہنچانے میں میرے مددگار بن جاؤ۔ کیا کشمیر کے مسلمان پیغمبر اسلام کی اِس آواز پر لبیک کہیں گے !؟



ISBN 978-81-7898-778-1

9 788178 987781

www.goodwordbooks.com